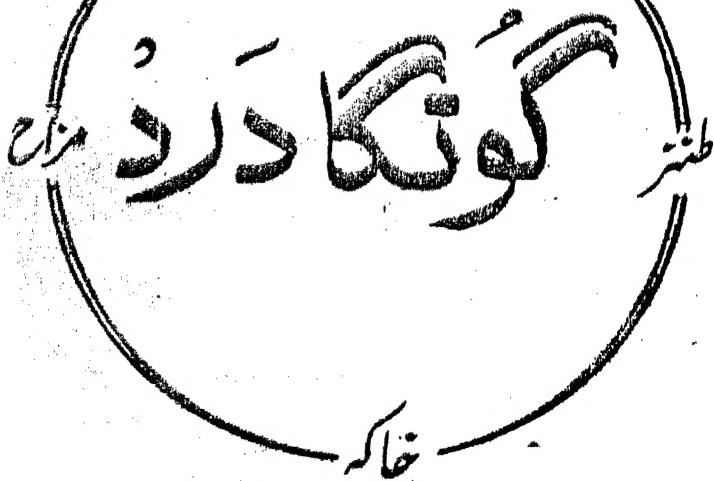


بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

احمد العبادي

عبدالله بن محمد
15-1-95

انشائیہ



غیاثِ صدیقی

جملہ حقوق بحق امجد صدیقی سلمہ محفوظ

سنہ اشاعت ۱۹۸۳ء

تعداد اشاعت پیراہ
طباعت نیشنل فائن پرنٹنگ پریس ٹھہلی کمان حیدر آباد
کتابت محمد عارف الدین
قیمت دس روپے سکہ ہند

بہ تعاون و تشکر ارو و اکیڈمی حیدر آباد، ای پی

ناشر

ادبی سنگم پبلیکیشنز، کالی کمان حیدر آباد و
اوارہ روزنامہ تسلیاتی ٹھہرگہ (کرناٹک)

ملنے کے پتے

- ☆ امجد صدیقی، مجاہد منزل (۲۲-۵-۲۲۲) کالی کمان حیدر آباد ای پی
- ☆ الیاس ٹریڈرس، شاہ علی بنہ، حیدر آباد
- ☆ نیشنل بک ڈپو، ٹھہلی کمان، حیدر آباد

انساب

جناب یحییٰ ویرجی ایڈیٹر روزنامہ ملاپ حیدر آباد دکن
 جناب سید وقار الدین صاحب ایڈیٹر روزنامہ رہنمائے دکن حیدر آباد
 جناب محمود انصاری صاحب ایڈیٹر روزنامہ منصف حیدر آباد

کے نام

جن کے دفاتر ادبی سازشوں کے گڈھ نہیں، بلکہ ادیبوں، شاعروں
 اور دانشوروں کے درمیان اتحاد، اجتماع اور
 اخلاص کے جذبات پیدا کئے گئے ہیں۔

احقر العباد

غیاث الدینی

مصنف کی تصنیفات، تالیفات اور تراجم

۱۵ روپے	۶۱۹۷۳	آواز کا رنگ (شعری مجموعہ)
۱۵ روپے	۶۱۹۷۶	فقس رنگ (شعری مجموعہ)
۷ روپے	۶۱۹۷۲	نیلم کے پنکھ (تنگو نظموں کا اردو ترجمہ)
۱۰ روپے	۶۱۹۸۳	گونگا درو (انٹرایٹ اور خاکے)
۹ روپے	۱۹۸۰	نیلم کے پنکھ طبع دوم

زیر طبع کتب :-

دستاویز شعری مجموعہ
 رنگ مالہ - شعری مجموعہ (دیوناگری رسم الخط میں)
 قطب النساء - عظیم مخزن کی حیات اور کارنامے (تحقیق)
 وکن کہ متانہ ہم عصر (شاعر، ادیب، نقاد)

حیات صدیقی، شخصیت اور فن از حبیب الرحمن ایم اے (عثمانیہ)

گونگا درو میں شائع شدہ ادبی مواد میں، نام، کردار، مقام واقعات قسقی فرضی ہیں۔ حقیقی افراد، مقامات، واقعات سے ان کی تشبیہ بعض اتفاقیہ ہے، پیشتر یا مصنف پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔

ترتیب

۱۔ تعارف

۲۔ دو باتیں

۳۔ سالی ۱۳

۴۔ شاعروں کا قبرستان ۱۹

۵۔ ایک سیما صفت دانشور ۳۷

۶۔ ایک شاگرد شاعر ۳۵

۷۔ تصنیف کا رد عمل ۳۴

۸۔ ادبی ڈکٹیٹر ۵۲

۹۔ سورج مکھی ۶۰

۱۰۔ پروسن ۶۶

۱۱۔ کلب کی ایک رات ۷۴

۱۲۔ مس کلاوتی انصاری ۸۰

۱۳۔ یہاں اس کا ۸۷

۱۴۔ ناگوار و ناگوار ۹۴

۱۵۔ تاثرات ۱۰۱ جناب محمد علی عباسی صاحب، محترمہ ڈاکٹر زینت

ڈاکٹر یوسف مرست صاحب، ڈاکٹر زینت

سید زبیر کا پی کر زبانِ حق کھولو

میں نے غارت سے سے غارتش وہ بھی جھوٹا ہے

غیاث صدیقی

تعارف

گونگا دھرد، جناب صدیقی کے انشائیوں، طنزیہ مضامین اور خاکوں کا مجموعہ ہے۔ ان میں بلند آہنگ نقارے اور تیز شہنائی کی کیفیت نہیں، تبسم زیر لب اور آہستہ آہستہ پھیلتی ہوئی چاندنی کی بہار ہے، یہی اس مجموعے کی امتیازی صفت ہے۔ اور یہ صفت بڑی قابلِ قدر ہے۔

ہمارے ملک میں غم و غصہ، رونا بسورنا، چیخ پکار، وعظ و ہندو بہت ہے لیکن مہذب انسان کی دوستی جس میں درگد کے لوگ ہی نہیں خود اپنی ذات بھی نشانہ ہو کم ہی ملتی ہے۔ یار لوگ یا تو ایسی طنز پر اثر آتے ہیں، جو تیزاب بن جاتی ہے، یا ایسے مفکروں کے لکھیل پر، جو سارے کا کرشمہ معلوم ہوتا ہے، پُر کطف خیال زندگی کے تشادات، ظاہر و باطن کا فرق، شخصیت کے اتار چڑھاؤ، دل چسپ واقعات کے بہاؤ۔

زبان کی نگارگری، ان کے ہاں بالکل لکھنے کے ہر لحاظ آتی ہے۔
 میں نے اس سے پہلے غیاث صدیقی صاحب کا کوئی مضمون نہیں پڑھا
 ہاں اس دور کی شہرہ نظم میں مزاح نگاری کے جو نمونے سامنے آئے ہیں
 وہ نکلے گئے ہیں، خود حیدر آباد میں زندہ دلان حیدر آباد کا غلط ہے
 مجھے ان مضامین کو پڑھ کر بہت لطف آیا۔ غیاث صدیقی اپنی بات
 بہت دلچسپی سے کہتے ہیں۔ چیزیات کی مصوری پر قدرت رکھتے
 ہیں۔ ایک ایک اینٹ رکھ کر عمارت بناتے ہیں، اور مجموعی تاثیر ہوتا
 ہے کہ ایک نیا پارہ وجود میں آیا ہے۔ اس مجموعے میں جہاں استاد،
 شاعروں کا قریبان، سالی، تصنیف کا رد و عمل، پڑوسن، ادبی و کثیر
 ایک شاگرد شاعر، ایک سیما صفت دانشور اور کلب کی ایک رات
 کل نو مضامین ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ ان میں کچھ جانے پہچانے اشخاص
 ٹائپ، مناسب رنگ اکیمیزی کے ساتھ مواد فراہم کرتے ہیں۔ اہم بات
 یہ ہے کہ زخم پہنچانا یا زک دینا مقصود نہیں، تضاد و امتزاجات
 لطف اٹھاتا ہے، غیاث صدیقی کے یہ مضامین پڑھ کر فرحت اللہ بیگ
 اور بطرس کی لطیف نگارش یاد آتی ہے۔ بچلتے چلاتے اور باتوں باتوں
 میں ہنسی نفیس اور گہری طنز بھی آجاتے ہیں۔ ملاحظہ کیجئے،
 ہندوستانیوں خصوصاً دکنیوں کو بچپن سے ہی ماں بات جو ہلا

☆ "منافع کا ہر سال تو سالی کے لئے ہوتا ہے، خسارے کا سال تو ماں باپ کے لئے ہوتا ہے۔" سالی لب سوز، لب ریز اور لب بند بھی ہوتی ہے۔

☆ "پکچر نہیں دیکھی، کلب نہیں گئے، ایک مشاعرہ ہی کر لیا۔"

☆ "محترمہ قطعاً ریاضہ نہیں بلکہ میں خود نروس بریک ڈلون کا شکار ہوں"

☆ "بچیوں کی استانیوں نے کہیں سایہ دار درخت بن کر کہیں ٹھنڈی جھیل بن کر لو دھی بھائی کی مدد کی ہے۔"

☆ "بارہ سال تک میں نے کامنی کوشل کا چہرہ اور ساغر کی کھٹک کو ایک ساتھ رکھا تھا لیکن یہ خواب ٹوٹ گیا۔"

طنز و مزاح ایک طور پر تلوار کی دھار پر چلنا ہے۔ ادبی ڈکٹیٹر اچھا خاصہ شروع ہوا تھا، آخر میں غیاث صاحب پٹری سے اتر گئے ہیں۔ ایک سیما ب صفت دانشور کے آخر میں بھی موڈ بدل جاتا ہے۔ مگر یہ خاکہ ہے اور شخصیت کی دھوپ چھاؤں کو ظاہر کرتا ہے، ہمارے کچھ شعرا کی نفسیات، ترقی پسندی اور جدیدیت کی آویزش، ادب اور صحافت میں اشتہار بازی، پروگنڈے کی حکومت، غرض غیاث صاحب نے اس دور کی بہت سی دلچسپ باتوں کو پُر نطف انداز میں پیش کر کے ہمارے لئے مسرت اور بصیرت کا بہت کچھ سالن فراہم کیا ہے۔ ان کے یہاں عشق کی وہ جست نہیں جو سارے مراحل پلک جھپکے میں طے کر دے، بلکہ وہ لطیف اور نرم اور دلکش راگنی ہے، جو رفتہ رفتہ

انسانوں کو اپنے ساتھ بھالے جاتی ہے۔ اور وہ اس دلچسپ سفر
 سے بہت کچھ حاصل کر لیتا ہے۔

میں غیاث صدیقی صاحب کو اس مجموعے کی اشاعت پر مبارکباد
 دیتا ہوں، اور امید کرتا ہوں کہ ادبی حلقوں میں اس کا مناسب خیر مقدم
 ہوگا۔

سر سید نگر، علی گڑھ
 ۶ فروری ۱۹۸۲ء

(پروفیسر) آلی احمد سرور

دو باتیں

- - مسز خاں مرحومہ صنعت و حرفت کی تربیت میں بہارت رکنتی تھیں۔
 آج بھی ان کی سینکڑوں شاگرد خواتین سارے ہندوستان میں اپنے فنون کی
 روشنی بکھیر رہی ہیں۔ غیاث صدیقی کو ان کے داماد کی حیثیت سے میں جانتا ہوں۔
- - ۱۹۵۳ء میں موصوف نے ماہ نامہ "سیوا" میں (جو خود ان کی
 ادارت میں شائع ہوتا تھا) ایک طنزیہ مضمون * اور - وہ مسکراتی رہیں *
 لکھا تھا۔ ماہ نامہ "سیوا" کی بیس ادارت، ڈاکٹر میرولی الدین صاحب،
 پروفیسر عبدالقادر سرودی صاحب، پروفیسر عبدالمجید مصطفیٰ صاحب، پنڈت
 ونشی دھر ودیا لنگار صاحب اور جہاں بانو نقوی صاحبہ پر مشتمل تھی۔
- - ۱۹۷۲ء میں ممتاز تلگو شاعر شری شیشندر شرما کی بیس جدید تلگو
 نظموں کا اردو ترجمہ * نیلم کے پنکھ * شائع ہوا تو، ڈاکٹر محمود حسین خاں،
 ڈاکٹر وحید اختر اور ڈاکٹر شمس الرحمن فاروقی نے اس کو بہت سراہا اور اس کی
 اشاعت پر غیاث صدیقی کو مبارکباد دی۔ یہ تخلیقی ترجمہ اشاعت کے
 ایک سال کے اندر ہی ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو گیا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن
 ۱۹۸۰ء میں شائع ہوا ہے۔

۱۹۷۳ء میں غیاث صدیقی کی طبع زاد نظموں اور غزلوں کا مجموعہ "آواز کا رنگ" شائع ہوا تو آندھرا پردیش اردو اکیڈمی نے انعام دیا۔
 ۱۹۷۶ء میں غزلوں اور نظموں پر مشتمل "نفس رنگ" شائع ہوا تو

آندھرا پردیش اور آتر پردیش کی اردو اکیڈمیوں نے انعامات دیئے۔
 ۱۹۷۸ء میں جناب و باب عندلیب (پنچرا اردو) نے "غیاث صدیقی" شہریت اور فن" لکھ کر غیاث صدیقی کی شاعرانہ صلاحیتوں پر روشنی ڈالنے کے علاوہ موثر نقادوں، ادیبوں اور دانشوروں کے قہ ثرات، تبصرے اور غیاث صدیقی کی نثر (انشائیہ، طنز و مزاح اور تنقید وغیرہ) کے نمونے بھی پیش کیے۔

• غیاث صدیقی نے "گونگا درد" کے نام سے مزاحیہ اور طنزیہ مضامین، خاکے اور انشائیے لکھے ہیں، اس میں ان کی باغ و بہار تحریریں ہیں، جو صفحہ اول سے آخر تک دل چپ اور پُر لطف ہیں، موضوعات اچھوتے ہیں، نئے نقطہ نظر سے لکھے، نئے اسلوب نگارش سے مزین ہیں ان کا مزاج زیر لب تبسم۔ اور ان کا طنز، گلاب کے کانٹوں کو چھسکا احساس، دلالت۔ "خود و ما" "سایا" اور شاعروں کا قبرستان "اردو طنز نگارش کے اعلیٰ نمونے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ یہ مجموعہ خاص و عام میں بہت جلد مقبولیت کی سند حاصل کر لے گا۔

خواجہ عبد الغفور
 ایچ، سی، ایس

حیدرآباد۔

سالی

ہندوستانی سماج میں اور اردو زبان میں سالی سے زیادہ خوبصورت کوئی لفظ مشکل ہی سے ملے گا۔ سالی تلفظ میں نرالی دودھ کی پیالی اور مقدر سے سالی ہو تو پھر کیا پوچھنا، سالی کا نام لیتے ہی زبان کی حرکت نکلی بیٹھی ہو جاتی ہے۔

در اصل سالی مختصر، مفید اور مقدس بھی ہوتی ہے۔

مختصر اس طرح کہ اگر آپ کی سالی کا نام "ماہ جبین" ہو اور وہ آپ کی بیوی سے عمر میں بڑی ہو تو آپ نہایت آسانی سے "جبین آپا" کہہ سکتے ہیں، اور اگر عمر میں چھوٹی ہو تو آپ بلا تکلف "ماہ جبین کا محف" بھم کر سکتے ہیں۔

کتنا مختصر نام ہے۔

اس طرح کہ آپ سسرال میں جہان میں اور آپ کو کوئی چیز بازار سے منگوانی ہو تو سالی کے سامنے جہاں میں ہاتھ ڈالے وہ فوراً آپ کو

روک دے گی اور اسی وقت آپ کی فرمائش کی تکمیل ہو جائے گی۔ میز پر
دستر خوان ہو یا چوکی ہو، وہ بڑھ بڑھ کر ایک سے ایک بڑھیا ڈش آپ کی
رکابی میں اٹھیتی جائے گی۔ سیٹی سیٹی باتیں بھی کرتی جائے گی۔ مزے مزے
کے سالنوں اور لڈو میٹھوں سے خاطر بھی کرتی جائے گی۔ چٹنی سالی لب سونڈ
لب رہز اور لب بند بھی ہوتی ہے۔

مقدس اس طرح کہ یہ آپ کو بھائی کہے گی اور آپ اس کو اپنی
حقیقی بہن ہے زیادہ پیار کریں گے۔ حقیقی بھائیوں کو تو بچپن ہی سے
غریب دوستی پیار کرنا پڑتا ہے اور اس پیار کو فرقی نسا کی طرح یا
قرض کا بوجھ جان کر ادا کرنا پڑتا ہے۔ جس میں ماں باپ کا خوف،
سماج کا ڈر اور استاد کی گھرکیاں بھی شامل ہوتی ہیں۔

سچا پیار جو دل سے کیا جاسکتا ہے، وہ صرف سالی ہی سے کیا
جاسکتا ہے۔ نہ اس کی تعلیم و تربیت کی ذمے داری آپ پر ہوتی ہے نہ
اس کی شادی کا بوجھ آپ کے سر ہوتا ہے۔ اس لئے سالی ایک گوارا بہن
ہوتی ہے، حقیقی بہن سے زیادہ دل دار و حق دار، محلے میں ایک خوش
قسمت حکیم شمسی رہتے تھے۔ نک چڑھے اتنے کرناک پر مکی کو نہیں بیٹھتے
دیتے لیکن سالی کی ہر بات کو پسند کرتے تھے۔ ایک مرتبہ تو اسی سالی نے
حکیم صاحب کے میاہ و روازے پر چاک پیس سے یہ شعر لکھ دیا تھا۔

ایسا ہے بہن تو شمس کی دوا کھا کے دیکھو

ہر بارہ دوا کھا کر دیکھو

پہلے تو پشاور پڑ کر آ رہا تھا ہاں ہر روز گنگا کیسے بہا بہا کہہ رہا تھا کہ
شہر ان کی چہیتی سالی نے لکھا تھا تو نہیں کہ خاموش ہو گئے اور کہنے لگے۔
”بڑی شہریر ہے سالی“

سالی کا رشتہ، ساپنچی اور ہندی کی رسموں سے شروع ہوتا ہے۔
بھائی کو پہلے ہی دن سالی کا رسمی طور پر غلام بن جانا پڑتا ہے۔ انکی چھڑا لے
کے لئے روپے نذر کرنے پڑتے ہیں۔ پھر شادی کے دن یہی سالی دو لٹا بھائی
سے دھنگا ناصول کرتی ہے۔ جوتے چراتی ہے، انعام لے کر واپس کرتی ہے۔
چوتھی کی شب پان کے بیڑے میں دو لٹا بھائی کو مریچ کھلا کر قہقہے لگاتی ہے۔
اور جب چوتھی کھیلی جاتی ہے تو دو لٹا بھائی کو پھولوں کی چھڑیوں سے مارتی
ہے۔ اب آپ ہی انصاف کیجئے کہ ان تمام نازک مراحل سے گزرنے کے
بعد سالی کو کیسے بھلایا جاسکتا ہے۔

حقیقی بہن کی تعلیم و تربیت سے لے کر بیاہ تک کی ذمہ داری
بھائی کے سر ہوتی ہے۔ اور اگر بہن کی شادی کسی جواری یا کسی علت میں
گرفتار شاعر سے ہو جائے تو پھر بھانجہ بھانجی کی پرورش کی ذمہ داری
اور ان کے روشن مستقبل کا بوجھ بھی یہ نصیب بھائی کے شانوں پر آ پڑتا ہے
اب آپ ہی انصاف کیجئے کہ بہن اور سالی میں کون زیادہ پسندیدہ کہلائی
جاسکتی ہے۔ اگر یومی اور سالی مغربی فیشن کی دلدادہ نکلیں تو پھر سمجھئے کہ
بہن کا تصور تک بھائی کے لئے ”جرم“ بلکہ ”گناہ“ بن جاتا ہے۔ سر پر
گھونسل جیسا جوتا باندھ کر پرفیوڈ مٹی ساڑیوں اور بے آستین پلاؤزوں

میں بیوی اور سالی کو ساتھ لے کر آپ سینا جا رہے ہوں تو راہ میں آنے والی بہن، کباب میں ہڈی کیوں نہ لگے۔ بہن تو بہن، ماں بھی اس وقت قابلِ توجہ نہیں رہتی۔ تنخواہ کا چوتھائی حصہ حسین بیوی اور نمکین سالی پر ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو ایصالِ ثواب جان کر خرچ کرنا دانش مندوں کا کام ہے ماں بہن کا کیا ہے جو دو، کھالیں گی، جو لاؤ بہن لیں گی، ان کا کام تو پکانا، کپڑے دھونا، گھر کا کام کاج کتنا ہوتا ہے۔ آخر کو بہن، بھائی کے گھر میں کام کاج نہیں سیکھے گی تو پھر کہاں سیکھے گی۔ سسرال جائے گی۔ اور وہاں کام کاج میں پیچھے رہے گی تو خواہ مخواہ بھائی بھادج کا نام رسوا ہو گا۔

سالی کا کیا ہے، بے چاری مہینے میں دو ایک مرتبہ آتی ہے۔ اس کے لئے مرغ یا مچھلی پکائی جائے۔ فیرنی یا پڈنگ بنائی جائے تو ایسی کو نسی قیامت آجائے گی۔ ماں بہن جتنا روز کھا جاتی ہیں کیا مہینے میں دو دن سالی کی میزبانی کے برابر خرچ اٹھتا ہے، اس پر ماں بہن کا دکھ درد، کپڑا لتا، آخر کو یہ سب کچھ بھی تو برداشت ہی کرنا پڑتا ہے۔ شادی کے بعد یہ پہلی عید آتی ہے اگر مالی کو کپڑوں کا ایک نیا جوڑا بنایا گیا تو گھر والوں سے لے کر محلے والوں تک کے منہ بگڑ گئے۔ ساری زندگی ماں بہن کی خدمت میں گزار دی۔ سالی کی ایک دن کی خوشی سب کو ناگوار ہے۔

ہر سال ماہ شعبان میں والد مرحوم کی قبر پر پھول چڑھائے جاتے ہیں۔ تو رملہ روٹی پر فاتحہ پڑھی جاتی ہے۔ اس سال اگر خسرو مرحوم کی برسی کی تو ہر ایک کا منہ بگڑ گیا۔ محلے کا ہر شخص کہنے لگا کہ وہ

”ہاں، یہی کی برسی میں تو رہا اور غصہ کی برسی میں ہر پانی؟“

یہ نہیں دیکھتے کہ بیوی، ساس اور سالی کی خاطر پہلی مرتبہ یہ سب کچھ کیا جا رہا ہے، گھرانے کی ناک بھی تو رکھنی پڑتی ہے۔

بے چاری سالی نے رد و کر منہ اٹھالیا ہے۔ رشتہ داروں کی تنقید کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ کیا خوب صورت ہونا، تعلیم یافتہ ہونا، فیشن کرنا، پیکچر دیکھنا کوئی جرم ہے۔ آخر سالی کا بھی کوئی حق ہوتا ہے۔

”ایک تاجر صاحب تو کہتے ہیں کہ منافع کا ہر سال ”حالی“ ہوتا ہے، خسارے کا سال تو وہاں نہیں آتا ہے۔“

اکثر ایسے لڑکے ہوتے ہیں جو رشتہ کرنے سے پہلے ہی دریافت کر لیتے ہیں کہ
بھئی! تم کو یہ بھی بتا دے گی، بشرط ایک عدد سالی کی ہے۔ سالی نہ ہوتو
شادی بلکہ زندگی بے کار ہے۔

ایک صاحب ہمارے گھر آئے، پکڑے نئے نئے لیکن چہرے پر مصنوعی
 غم کے آثار۔ یہ تضاد ہماری سمجھ سے باہر تھا۔ دریافت کرنے پر انہوں نے
 "بھائی صاحب دو ماہ قبل میری بیوی کا زچگی میں انتقال ہو گیا۔
 تین چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑ کر وہ رخصت ہوئیں۔ اتنا کہہ کر موصوف
 ابدیدہ ہو گئے۔ ہم نے صبر کی تلقین کی۔ موصوف کہنے لگے: "صبر ہی تو کیا
 دو ماہ تک۔"

دو ماہ تک۔
سارے رشتے دار اور محلے والے بضد ہو گئے کہ آخر بیوی کے بغیر
زندگی کیسے گزارو گے، بچے بھی چھوٹے چھوٹے ہیں اور دھڑلے سے گزر رہا ہے۔

اُدھر بچوں کا خیال رکھیں گے۔ اُنہی اپنی جان نالواں پر لب لہلہا لہیں گے۔
 آپ؟ پہلی شہادت میں خسر صاحب کے ہاں اپنی چھوٹی سالی کے لیے پیام
 بھجوا دیجئے۔ وہی ایک بچوں کی جمع ماں بن سکتی ہے۔ پھر دوسرے۔ آخر
 کو سب لوگوں نے مل کر کل شام میرا عقد چھوٹی سالی سے کروا کر ہی دم لیا
 ہم نے ثوراً کہا۔ ”بھائی صاحب، یہ بہت اچھا ہوا آپ نے
 گھر کی دوا رکھ رہی ہیں گرائی“

شاعروں کا قبرستان

کسی محفل میں پچاس شاعر ہوں تو بھی بشیر بھائی واحد سامع ہوتے ہیں۔ ایسے ہی ایک مشاعرے میں میں بھی شریک تھا۔ مشاعرے تین بجے رات رات کو ختم ہوا اور میں وہاں سے بھاگ نکلا۔ سمٹ روڈ پر آتے ہی پہلی نظر بشیر بھائی پر پڑی۔ میرا ہاتھ بڑے خلوص سے تھاما اور مجھے ایک انیونی چائے خانے لے گئے۔ رات کے تین بجے نہاری اور شیر مال سے میری خاطر کی اور گرم گرم چائے کی کپ میں، میں ان کے احسان تلے ڈوب گیا۔

بشیر بھائی، شاعروں کو کھلانے پلانے کی عمدت ہی محدود نہیں ہیں۔ شاعروں میں آئے دن مختلف سطحوں پر لڑائیاں بھی ہوتی ہیں، لڑائی اور بڑائی اس دانشور طبیعت کی بین الاقوامی ہانی بھی ہے۔ اور پوری حق بھی۔

ابنہ مادری زبان کے کنویں میں رہنے کے حق سے کم از کم اردو کے شاعر

و مست بر دار چمن کہ تبار نہیں ہیں

ایک مرتبہ بشیر بھائی نے مجھ کو بڑی محبت سے کہہ سنا کہ لفظ
"انا" کے معنی دریافت کیے۔ میں نے کہا خیر تو ہے، آخر آپ کو اس "انا"
سے کیا غرض؟

"کہنے لگے میں اردو کے کسی شاعر سے بھی گفتگو کرتا ہوں تو دس
منٹ کی گفتگو میں وہ بڑی تمکنت سے "انا" کا لفظ بیس مرتبہ استعمال
کرتا ہے۔ میں نے کہا۔

"بشیر بھائی، خدا کا شکر ادا کرو کہ آپ کو صرف "انا" سے سابقہ
پڑا ہے۔ بعض صورتوں میں آپ کو "غنا" سے بھی واسطہ پڑ سکتا ہے اور
یہ غنا آپ کو "غنا" کا درجہ عطا کر سکتا ہے۔

بشیر بھائی اکثر مجھ سے دریافت کرتے ہیں کہ حیدر آباد میں اردو کا سب سے
بڑا شاعر کون ہے۔ بھلا ان کو میں کیا جواب دے سکتا ہوں۔ جب کہ میں
خود بھی شاعر ہوں۔ وہ تنگ اگر کہتے ہیں کہ ایک صاحب خود کو سب سے بڑا
شاعر اس لئے سمجھتے ہیں کہ ان کی عمر اکثر شاعروں سے زیادہ ہے۔

ایک اور حضرت خود کو سب سے عظیم شاعر اس لئے جانتے ہیں کہ اردو
کے ایم اے ہیں۔ ایک اور شاعر نے اپنی عظمت کی بنیاد اس پر رکھی ہے کہ وہ
سارے ہندوستان میں کل ہند شاعرے سب سے زیادہ پڑھتے ہیں۔ ایک
اور صاحب ہیں جن کا ادعا ہے کہ ان سے زیادہ معاوضہ آج تک کسی اور شاعر
کو نہیں ملا۔ ایک صاحب کو اپنی عظمت اپنے مقبول عام ترنم میں نظر آتی ہے

ایک اور محترم ہیں جن کا ادعا ہے، چونکہ ہر شاعر میں سب کے بعد ان کو بڑھایا جاتا ہے اور شاعرے کے ہر اشتہار میں ان کا نام سب سے پہلے شائع کیا جاتا ہے، اس لئے سب سے بڑے شاعر وہی ہیں۔ ایک اس صاحب ہیں جو اپنے تئیں فراق اور فیض سے بھی بڑا شاعر سمجھتے ہیں، محض اس لئے کہ ان کی غزلوں میں کچھ شبہ یہ گانے والیاں اور گانے والے گانے ہیں، اور وہ بیش بہا نغمے ریکارڈوں میں اسیر ہیں۔

ایک شاعر اور ہیں جن کو اپنی عظمت کا یقین اس بات پر ہے کہ ... کلاسیکی شاعری، ترقی پسند شاعری اور جدید شاعری کے فرق و امتیاز کو ان کے علاوہ کسی اور نے نہ سمجھا ہے اور نہ برتا ہے۔ ایک اور شاعر جس کی عظمت کے مرض میں مبتلا ہیں۔ ان کو خود پر استاد شاعر ہونے کا یقین ہے۔ بے شک ان کے حلقہ سلازہ میں ہر پیشے، ہر سطح اور ہر جنس کے شاعر موجود ہیں جو ان کی استادی کی ڈفلی پیٹے رہتے ہیں۔

ایک اور شاعر ہیں جن کے گھر قدرت نے اچھی تہریانی سے ایک مٹی بار عطا کیا ہے وہ بے چارہ تو منکسر المزاج ہے، لیکن وہ بالکل بچ کر اردو کا نقاد اور شاعر اسکاچ دہسکی کے چوتھے پیک پر اپنی اپنی مادری زبان میں اُس کو ہندو پاک میں سب سے بڑا شاعر بنا دیتا ہے۔ غرض عظمت کے ان مختلف معیاروں نے بشیر جہانی کو بہت پریشان کر رکھا ہے۔ اور وہ صحیح فیصلے پر پہنچنے سے قاصر ہیں۔ لیکن کسی عظیم شاعر کے لئے جو ضرور ہے اور مشترک اقدار ہیں ان کا اندازہ بشیر جہانی کو ایک حد تک ہو چکا ہے۔ مثال

کے طور پر عظیم شاعر کے لئے ضروری ہے کہ اس کے ہاں لمبے لمبے دیوانے، شراب اور سگریٹ مانگ کر بیٹا ہو۔ ترنم کا ماہر ہو، خود مستانی اور شیخی کے فنی سے داف ہو، کسی اخبار کے ایڈیٹر کا یا اس کے کسی چمچے کا منظور نظر ہو۔ اپنے سوا ہر شاعر کی تصحیک ایڈیٹر کے کمرے میں کرتا رہے۔ بشیر بھائی بہرہ و اکراہ یہ سب کچھ برداشت کر لیتے ہیں، پھر بھی شاعروں سے بے پناہ محبت کرتے ہیں۔

ایک روز علی الصبح بشیر بھائی تشریف لائے اور اطلاع دی کہ گزشتہ شب فلاں شاعر کا انتقال ہو گیا۔ رات ہی کو اردو کے ایک ادارے کی جانب سے چار سو روپے مرحوم کے گھر تجہیز و تکفین کے لئے بھجوا دیئے گئے تھے۔ ہم سب مطمئن ہوئے تھے کہ مسئلہ حل ہو گیا لیکن صبح کو معلوم ہوا کہ مرحوم شاعر کی چار بیویاں تھیں، اور ہر ایک نے سو سو روپے آپس میں تقسیم کر لئے ہیں، تدفین کا مسئلہ جوں کا توں پڑا رہ گیا ہے۔ بشیر بھائی آگے بڑھے اور مرحوم کی آخری خدمت بھی انجام دے دی۔

بشیر بھائی بڑے قاعدے کے آدمی ہیں۔ ہر کام کو سلیقے اور قرینے سے تکمیل تک پہنچاتے ہیں۔ اب ان کو یہ فکر دامن گیر تھی کہ شاعر زندہ گی میں تو متحد نہ ہو سکے، ایک دوسرے سے قریب نہ ہو سکے، گم ارگم مر لے گئے بعد ان کو ایک دوسرے کے قریب دفن کیا جائے۔ یہ سوچ کر انھوں نے اپنی افتادہ زمین چار سو مربع گز کا ایک خطہ علیحدہ کر کے اس کے اطراف چار دیواری پچھڑائی اور اس میں ایک مختصر سا سا بن اور ایک چھوٹا سا کمرہ بھی بنوا دیا۔ سا بنان اس قدر طریقے و طریقے تھا کہ وقت و احد میں دو شاعروں کے جنازے رکھے

ہاں سب سے پہلے اور کم سے کم ہزار اینٹیں سلیقے سے جمادی تھیں، بغیر پتھر لایا
 سنٹ کے تھیلے اور ایک ہزار اینٹیں سلیقے سے جمادی تھیں، بغیر پتھر لایا
 پانی کے لئے مٹی کے کوزے اور گھڑے ایک طرف رکھے تھے۔ بشیر بھائی کے
 سلیقے کی کیا تعریف کی جائے۔ مختصر یہ کہ شاعروں کی تجہیز و تکفین کا مکمل
 انتظام کرنے کے بعد بھی وہ مطمئن نہیں ہوئے، کہنے لگے کہ ایک ایک گز کے
 فاصلے سے قبریں بھی تیار کر دی جائیں، اور بے تحریر کے کتبہ بھی قبروں کے
 سرہارنے عارضی طور پر لگا دیئے جائیں تو مناسب ہے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔
 پہلی فرصت میں ایک درجن قبریں تیار کر دی گئیں، اور بشیر بھائی ہر محلے کے
 شاعر کو نہایت سلیقے سے دفن کرنے لگے۔ ان کو مسرت اس بات کی تھی کہ
 وہ شاعروں کو مرنے کے بعد تو ایک دوسرے کے قریب کر سکے۔

ایک سبز بشیر بھائی آئے چہرے پر اضطراب تھا، اپنے لگے کہ گزشتہ
 شب فلاں شاعر کا انتقال ہو گیا۔ میں نے صبح کو ان کے لئے قبر نمبر چھ الاٹ
 کی تھی۔ بس قیامت آگئی۔ مرحوم کے بیوی بچے آئے۔ بے تحاشہ سر پیٹنے اور
 رونے لگے۔ میں نے وجہ دریافت کی، کہنے لگے۔

”مرحوم نے وصیت کی تھی کہ ان کو ہرگز ہرگز قبر نمبر چھ میں دفن نہ کیا
 جائے۔ مرحوم جدید شاعر تھے اور قبر نمبر پانچ میں ترقی پسند شاعر مدفون ہیں
 مرحوم کی روح کو تکلیف پہنچے گی۔ خدا کے لئے ایک قبر چھوڑ کر قبر نمبر سات
 مرحوم کے لئے الاٹ کی جائے اور قبر نمبر چھ اور قبر نمبر آٹھ یعنی مرحوم کے
 دونوں پہلوؤں میں کسی شاعر کو دفن کیا جائے، خواہ وہ کسی بھی مکتب خیال کی

حامل ہوں۔ مرحوم کو کوئی اعزاز نہیں؟
 اب بشیر بھائی کے لئے کئی مسئلے پیدا ہو گئے تھے۔ بشیر بھائی اپنی پسند
 اور صلح جو انسان تھے۔ مرحوم شاعر کی وصیت پر عمل تو کر دیا، لیکن مستقبل کے
 اندیشوں سے ہراساں تھے۔ ایک ریٹائرڈ آفیسر کی مدد لینی پڑی، جس نے
 مستقبل کے لئے ایک پروگرام بنانے میں بشیر بھائی کی مدد کی اور ایک پروجیکٹ
 تیار ہو گیا۔

ہوا یوں کہ تنظیم نو کے تحت صف بندی کی گئی۔ کلاسیکی شاعروں کی
 قبروں کے لئے کچھ صفیں، کچھ صفیں، کچھ ترقی پسندوں کے لئے اور کچھ جدیدوں
 کے لئے۔ مذہبی شاعروں کو شاعرات کی قبروں سے بہت دور کھجوروں کے
 درختوں کے نیچے دفن کرنے کا انتظام کیا گیا تاکہ آئندہ تدفین کے موقع پر کوئی
 خلل نہ ہو سکے۔ اس اسکیم کی تکمیل کے بعد بشیر بھائی نے مجھ سے کہا۔ ...
 رخصت نمایاں تھی کہ صفیں علیحدہ ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ میرا مقصد تو پورا
 ہو گا ہی، سب کے سب ایک ہی احاطے میں دفن تو ہوں گے، ایک دوسرے
 کے قریب تو ہوں گے۔ میں نے بھی ہاں میں ہاں ملا دی۔

خدا خدا کر کے ابھی اس مسئلے سے نمٹے ہی تھے کہ ایک نیا مسئلہ پیدا
 ہو گیا۔ ہوا یہ کہ ایک ہر دلحزیز شاعر جن کا ترنم بھی درجہ اول کا تھا۔ انتقال
 کر گئے لیکن شاعروں کا ہجوم بشیر بھائی کے گھر پر قیامت کا منظر پیش کر رہا
 تھا۔ اور سب کا مطالبہ تھا کہ مرحوم کو شاعروں کے قبرستان میں دفن نہ کیا
 جائے۔ وجہ اس کی یہ تھی مرحوم کو، کوئی شاعر یا کوئی نقاد، شاعر تسلیم کرنے

کے لئے تیار نہیں تھا۔ سب یہی کہتے تھے کہ مرحوم متشاعر تھے یعنی شاعر واعر تو تھے نہیں البتہ ترنم اچھا تھا۔ یا تو وہ خود قوال تھے یا کسی قوال کی نسل سے تھے۔ لوگ باگ ان کو غزلیں کہہ کر دے دیا کرتے تھے۔ ایک سو مستند سامعین، پچاس منتظمین، پچاس شاعرات اور دو سو شعرائے کرام حلف لے چکے ہیں یعنی جملہ چار سو بیس افراد انی ڈیوٹ (Affidavit) پر دستخط کر چکے تھے کہ مرحوم متشاعر تھے۔ ان کو اس مقدس قبرستان میں دفن کرنا ملک کے عظیم دانشور طبقے، عظیم شعرا باذوق سامعین اور حاتم دل منتظمین کی توہین کے مترادف تھا۔ بشیر بھائی بے بسی سے بولے:

”خیر کوئی بات نہیں شاعروں کے قبرستان کے پچھوڑے تھوڑی سی جگہ خالی ہے، وہیں مرحوم کو دفنایا جائے گا۔ اس تجویز پر تو سب لوگ آپے سے باہر ہو گئے۔ کہنے لگے۔

”کبھی اس جانب کی دیوار ۵۰ دو سو سال کے بعد گر جائے تو لوگ ان کی قبروں کو بھی شاعروں کی قبروں میں شامل کر کے احاطے کی دیوار کو وسیع کر لیں گے اور پھر ان متشاعروں کو بھی شاعروں میں گنا جانے لگے گا۔ لہذا قبرستان کے پچھوڑے بھی مرحوم کو دفن کرنے کے لئے مجمع راضی نہ ہوا۔ البتہ یہ طے ہو گیا کہ قبرستان کے پچھوڑے کھلی جگہ اصلی مزاحیہ شاعروں کے لئے وقف کی جاسکتی ہے۔ بشیر بھائی مایوس ہوئے اور بے چارے مرحوم کو لے جا کر ایک لاوارث قبرستان میں دفن کر دیا۔ تدفین کے بعد لوگوں نے دیکھا کہ مرحوم کی دائیں جانب ایک شان دار قبر

جی دیکھ تھی۔ کتبہ پڑھا تو معلوم ہوا کہ ہزار سٹروائس لکھا، ڈیڑھ لکھ الپ لکھی
 کے ایک وفادار ملازم کی قبر تھی۔ فرماں برداری کے صلے میں فرم نے اس کی
 شاندار قبر تیار کی تھی۔

"تدفین کے بعد بشیر بھائی بہت غمگین نظر آ رہے تھے لیکن سائے
 شاعر نقاد اور باذوق سامعین مسرور تھے کہ مرحوم کو ہزار سٹروائس
 کپنی کے قریب جگہ ملی ہے اور بعض شعرا یہ شعر گنگنا رہے تھے۔

کند ہم جنس با ہم جنس پرواز
 کبوتر با کبوتر، باز با باز

ایک سیلاب صفت دانشور

میں نے اپنی ساری زندگی میں صرف ایک شاعر پر دو نظمیں کہیں، اور
ایک قطعہ کہا۔ وہ تھا مخدوم، اسی بہانے مخدوم پر میری نظم پڑھ لیجئے۔
مخدوم کے جنازے کے ساتھ چلتے چلتے یہ نظم پڑھی تھی

ایک ہیرے کے ہزاروں پہلو
منعکس نور کہیں، رنگ کہیں

سخت جاں ایسا

کہ لاکھوں نظریں

اس سے ٹکرا کے پلٹ جاتی تھیں

نور کی دھار سے ٹٹ جاتی تھیں

کہتے ہیں آج اسی ہیرے کو

اپنے سینے سے مکائے ہوئے مٹی کی تہیں
 ڈوبتی جاتی ہیں تاریکی میں
 لیکن اے ہم وطنو!
 میرے مخدوم کی روح
 شہر خاموشی میں خوابیدہ ہے
 درد کے پردہ دیوار سے وابستہ ہے۔

مخدوم بھائی اور لودھی بھائی (نواب غلام محمد خاں لودھی، سابق
 ڈپٹی میئر عظیم تر حیدر آباد واسپیشل میڈیٹو پالیٹین مجسٹریٹ کی شخصیتیں
 پہلو دار ہیں، اور برہیلوز زندگی کو آئینہ دکھاتا ہے۔ مخدوم بھائی کمیونسٹ
 پارٹی سے وابستہ تھے، اور لودھی بھائی کانگریس سے۔ وہ سخن درتھے اور
 یہ سخن فہم۔ مخدوم جی مسائل کو کٹے گراٹھے تھے وہ ان کے اپنے مسائل بھی
 تھے، لیکن لودھی جی ہماری جاگیر دار ہونے کے باوجود مزدوروں کے مسائل سے
 وابستہ ہیں۔ مخدوم کی روح آفاقی اور درد کے پردہ دیوار سے وابستہ ہے
 اور لودھی بھائی سبب بھی غریب نادار بچوں کو ہوٹلوں، گریوں اور دوکانوں میں
 ملازم دیکھتے ہیں تو انھیں اس بات کا شدید احساس ہوتا ہے، کہ ہائے لکھنے
 پڑھنے کی مٹی کی مزدوری میں گزر رہی ہے، ان کی راتیں فٹ پاتھ پر
 بسر ہو رہی ہیں۔

قوم کی عزت فٹ پاتھوں پر سوتی ہے
 ننھے دسک۔ مکتب کی چراہوں میں کچھ پڑے ہیں

مخدوم کے کہنی عزم نے ان کو ایک مسلک اور ایک ہی سیاسی پارٹی سے وابستہ رکھا لیکن لودھی بھائی کی سیاست میں لے کر چھوٹی ملی ناکامی نے بعد میں ان کی تلاش کرنے کی کوشش کی، اس میں ذاتی منفعت شامل نہیں تھی بلکہ عوام کے مسائل کا حل ڈھونڈنے کی کوشش تھی جس میں شدت بھی تھی اور جاگیردارانہ غصہ بھی شامل تھا۔ لودھی بھائی اور مخدوم بھائی میں ایک اور صفت مشترک ہے وہ یہ کہ دونوں سدا بہار کے نمونے ہیں۔

ڈاکٹر زینت ساجدہ نے مخدوم کے تعلق سے کہا تھا لیکن میں لودھی بھائی کے تعلق سے کہتا ہوں کہ لودھی بھائی جب کبھی کسی نوجوان حسین لڑکی کو قریب سے گزرتا ہوتی دیکھ لیتے ہیں تو اپنے کھادی کے بش شرٹ کا کالر درست کر لیتے ہیں۔ لڑکی تھوڑی دیر کے لئے ٹھٹھک کر رہ جاتی ہے اور اس لڑکی کی ماں آگے بڑھ کر کہتی ہے۔

”بیٹی سلام کرو، یہ لودھی چاچا ہیں، میرے نانا کے ہم جماعت رہ چکے ہیں۔“ لودھی بھائی کے تعلق سے یہ بات مشہور ہے کہ وہ پہلے بچہ کر دیتے ہیں اور بعد میں سوچتے ہیں کہ انھیں کیا کرنا چاہیے تھا۔ یعنی فکر و نظر کم اعتبار سے بھی پٹھان کی یہی نشانیاں ہوتی ہیں۔ کسی زمانے میں ابراہیم لودھی نے مخلوق سے شکست کھائی ہوگی۔ لودھی بھائی، ابراہیم لودھی کی اولاد سے ہونے کے باوجود کسی مسئلے پر بھی شکست تسلیم کرنے آمادہ نہیں۔ وہ کبھی ہار نہیں مانیں گے، وہ جانب دار ہیں۔ وہ پسند، ناپسند کے اسیر ہیں۔ خود تنقیدی کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ اس طرح کے آپ ہزار الزام ان پر

رکشا میں مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کے لئے تنقل کردار صحیح ہونی چاہیے۔
 کچھ سوچا ہے، اسی بات ان کے لئے تنقل کردار صحیح ہونی چاہیے۔
 میں نے دیکھا ہے کہ وہ صمہام الملک کی دیڑھی سے علی الصبح سائیکل
 پر نکلے ہیں۔ رکن بلدیہ کی حیثیت سے سارے محلے کی کیفیت لے رہے
 ہیں۔ بلدیہ کے خلاف شکایتیں ڈائری میں نوٹ کرتے جا رہے ہیں اور بلدیہ
 کی اجازت کے بغیر تعمیر کی ہوئی ان گھر کیوں کو جن پر چھول دار پردے پڑے
 ہوئے ہیں۔ لودھی بھائی گھورتے بھی جا رہے ہیں۔ گھر لوٹے ہیں، ناشتہ کیا
 ہے اور بچوں کو کار میں ساتھ لے کر اسکول پہنچے ہیں۔ بچوں کو وہاں چھوٹنے
 کے بعد اگر ضرورت محسوس کی تو کچھ دیر بچوں کی ٹیوٹر سے ضروری بات بھی کر لی۔
 پھر بلدیہ کے دفتر آگئے ہیں۔ وہاں کے کاموں سے فارغ ہو کر گھر پہنچ گئے ہیں۔
 ان کا یہ عمل رکن بلدیہ سے لے کر عظیم تر حیدر آباد کے ڈپٹی میئر ہونے تک برابر
 جاری رہا۔ اس دوران بچوں کی ٹیوٹر سے ملنے کا اہم کام بھی نظر انداز نہیں کیا۔
 میں نے انھیں سر مغرب پینٹ بش شرٹ میں سمٹ روڈ پر ٹہلتے
 بھی دیکھا ہے۔ رکشا میں، بس میں بھی دیکھا ہے۔ ایک ہی دن میں سائیکل
 موٹر کار، رکشا، پیدل اور بس میں سفر کرتے بھی دیکھا ہے۔ نہ موٹر نشینی
 کے سئے پیشانی پر غرور و تکبر کے نشان تھے۔ نہ سائیکل بس اور رکشا
 میں بیٹھے وقت احساس کمتری کا شکار تھے۔ یہ معمولی باتیں نہیں ہیں۔ جو
 لوگ زندگی کے حقائق کے عارف ہوتے ہیں، وہ ان سطحی اور معمولی احساسات
 سے بہت بلند ہوتے ہیں۔

ان کے سیاسی راستے بدلنے سے میں ہمیشہ اختلاف کرتا رہا۔ لیکن اس بات کا میں قائل رہا کہ وہ ہمیشہ حق پر رہے۔ انھوں نے جھوٹ سے کبھی مہمالت نہیں کی۔ لچک دار رویت آج کی سیاست میں بڑے ضروری ہے اور یہ بات اصلی پٹھانوں کے بس کی نہیں۔ ان سے جو نیر لوگ آج پارٹی کے بڑے بڑے کلیدی عهدوں پر فائز ہیں۔ لیکن لودھی بھائی اب بھی حق کی اور انصاف کی کرسی پر براجمان ہیں اور ملاتیں ہیں۔ لودھی بھائی، فارسی، ہندی، اردو اور ملگویت واقف ضرور ہیں لیکن انگریزی ادب اور اردو ادب میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ اردو ادب سے ان کی وابستگی کے سلسلے میں تیس سال پہلے کا ایک واقعہ آپ بھی سن لیتے۔

لاہور کا شہر ہے۔ وسیع و عریض مولیٰ کی پخت پر سفید چاندنی کا فرش ہے۔ گرمی کا موسم ہے۔ چودھویں رات کا چاند حاضرین پر چاندی کے درق برسا رہا ہے۔ دیواروں سے گاؤں کی لگے ہیں۔ گلاب اور کیڑے میٹھے گوتی ہوئی مدر کی لال لال صافوں میں ننھی ننھی گلوریاں کشتیوں میں بھی ہوئی ہیں۔ حلقوں کے دھندلے کیلے، شگ و غبر و زعفران کی خوشبو میں حاضرین کو مست کر رہی ہیں۔ پیپروں پر موتیا کی لڑیاں عجیب بہار دکھا رہی ہیں۔ مشاعرہ اختتام کے قریب آپہنچا ہے۔ شیخ اشرف الحکما حضرت حکیم آشفقہ لکھنوی کے سامنے آئی۔ موصوف لکھنوی کی زبان کے شاعر ہی نہیں بلکہ استاد بھی تھے۔ وہ نزل پڑھا کہ سامعین لوٹ پوٹ ہو گئے۔ لیکن وہ ٹھہرا لکھنوی، اعتراض و تنقید کرنا پیدائشی حق بڑے بڑے بڑا اعتراضات کئے ہیں۔ میر تقی میر کو بھی جواب دینا پڑا تھا

سہ پہلے آشفۃ کس منت ہی ایک صاحب ہانکی تر بھی ٹوپی پہنہ۔ نیچی چولی کے
انکر کے میں ملبوس موچھوں پرتاؤ دے کر بولے۔

حضرت آشفۃ ! یہ محاورہ صم ہو جانا، اہل لکھنؤ نہیں بولتے اور یہ
بے معنی بھی معلوم ہوتا ہے، بلکہ چارے آشفۃ مرحوم نے کچھ بھی جواب نہ دیا،
پی گئے۔۔۔ سرخ و سفید رنگ کا بڑے بڑے دیدوں والا نوجوان اٹھا۔
سفید اچکن اور ارب کے پاجامے میں ملبوس، لہجہ باوقار اور اعتماد کے سمئے
تھا۔ آگے بڑھا اور کہنے لگا۔

محضور گستاخی معاف ! آپ جیسے بزرگ حضرات کے روبرو ایسا
زبان کھولنے کی جسارت کیسے کر سکتا ہے، لیکن خاموش رہنے سے سخن فہمی کے
ذوق پر آنے آتی ہے اس وقت حضرت آشفۃ اعتراض کیا۔ اس نے جواب دیا
کچھ عرض کرنا احقر کے لئے واجب ہے۔ یہاں صم ہو جانا کے معنی سیم کرنا
و صامت ہو جانا کے معنی اٹھنا اور اس نوجوان کو لگا
ٹھاپا۔ پوچھا۔ "ما جزا دے تم کو پس نے یہ معنی سمجھائے تھے۔"
نوجوان نے کہا۔ "میں نے حیدر آباد میں اپنی ماں کو، نانی کو، دادی کو یہ بتا دیا
بولتے سنا ہے۔"

"تو کوا جیسے ہی بے نظیر کی چوری پکڑی گئی، اس کے کمرے سے کپڑا
اور زیور کی کٹھڑی برآمد ہوئی تو بس، ہمارے روبرو گردن جھکا کر کٹھڑی
گئی تھی، بس کچھ لو صم ہو گئی تھی، منہ سے کچھ نہ نکلتا تھا۔ اب حکیم آشفۃ
شیر ہونے، کہنے لگے۔۔۔ مزید کچھ اعتراضات ہوں تو اس لڑکا

سے پوچھ لیجئے، یہ سرخ و سفید نوجوان ہیں کہ اخباروں پر سبز و آغاجہ مورا
تھا، نواب غلام محمد خاں لودھی تھے۔

لودھی بھائی قریباً ہر اہم شاعرے میں آئے ہیں اور داد و بنیاد میں
ہمیشہ انصاف کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ شاعروں سے زیادہ شاعرات کا کلام پسند
کرتے ہیں۔ ان کی وجہ دراصل ان کا موسیقی سے لگاؤ ہے۔ ان کا خیال ہے
کہ شاعرانہ لہجہ اشعار کے تاثر کو ترنم کا کندھا لگا کر خوب داد حاصل کرتی
ہی۔

لودھی بھائی کہ میں نے سازوں اور آوازوں سے بھی کھیلتے دیکھا ہے،
راگ پہچان کر اس کی نزاکتوں کی طاقت دینا کوئی ان سے سیکھے۔ گانے
والی خاتون اگر ملیج بھی ہو تو لودھی بھائی کی داد اُن کو چھو لے نکلتی ہے۔ موسیقی
سے لگاؤ بھی ان کے کردار کا ایک جمالیاتی پہلو ہے۔ لودھی بھائی نہ صرف اچھے
نثر نگار کی طرح اچھی اردو بولتے ہیں، بلکہ انگریزی بھی روانی کے ساتھ بولتے ہیں
تلفظ سے انگریز نہیں بلکہ صاف ہندوستانی معلوم ہوتے ہیں۔ انگریزی میں ادبی
زبان سے لے کر قانونی زبان تک سب سے واقف ہیں۔ اردو سے انگریزی تک یہ
سفر انھوں نے درمیانی عمر میں طے کیا ہے اور بہت جلد طے کیا ہے۔ اس سفر
میں بچوں کی استانیوں نے کہیں سایہ دار مدد نہ دی کہ کہیں ٹھنڈی جھیل بن کر
لودھی بھائی کی مدد کی ہے اور سفر کو آسان و خوش گوار بنایا ہے۔ لودھی بھائی
کے ہاں سینکڑوں سانس لیتے زبیدہ انگریزی ناول ہیں۔ ڈاکٹر عبد الطیف رحیم
نے ایک مرتبہ لودھی بھائی سے انگریزی میں مسودہ لکھوایا تھا۔ اور بنظر اصلاح

دیکھ کر فرمایا تھا۔

”آر جیسے جاہل لوگ عطا کرنے کا حق دیتی تو تم کو انگریزی ادب میں ایم، اے کی ڈگری دے کر فخر محسوس کرتا۔ یہ ساری صلاحیتیں لو دھبی بھائی کو کسی بڑے عہدے تک پہنچانے میں ناکام رہیں۔ جتنی کوئی اور قلندر میس ساری عمر گزار دی۔“

”سچ ضرور ہے۔ لیکن بھئی اٹھایا، کبھی نہیں کھایا۔ اس کی سفارش کی، اس کا کام نکالا۔ اس سے حق کی خاطر جھگڑا کیا، اس سے مروت کے مارے بات کر لی۔ خدمتِ خلق کا یہ آفتاب علی الصبح گھر سے طلوع ہوتا ہے۔ اور رات کو اپنے یہ روٹیں گھر سے غروب ہو جاتا ہے۔ نہ سونا، نہ چاندی، نہ ٹھکانہ، نہ بازار۔ قرضے، قرضوں کی مدد کرنا ان کا مذہب ہے۔ خود بولتے ہیں اور دوسروں کو فعلیں کاسٹنگی اجازت دے دیتے ہیں۔ یہ محبت بولنے والے بات و فصل کہتے سے بے نیاز ہیں۔ یہ ہاتھ آفتی تا آفتی پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ ہاتھ بھی اپنی کی حد تک محدود نہیں بلکہ علی سید دار جعفری کے سلاوا،

ان باتوں کی تعلیم کرو، ان باتوں کی تکریم کرو
دنیا کے چلانے والے ہیں، ان باتوں کو تعلیم کرو

ایک شاگرد شاعر

میں اپنے مطب میں بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ لہج کے بعد قیلولہ میرے
لئے ضروری ہے، لیکن ایک نظم جنم لینے کے تیار تھی۔ ہاتھ میں قلم اور میز پر
فل اسکیپ سائز کا پیڈ رکھا ہے۔ مطب کے دروازے پر کھٹکا ہوا۔
احمد ندیم قاسمی کا یہ شعر پڑھتا ہوا ہا ہر نکلا :

انداز ہو بہو تری آوازِ پا کا تھا
دیکھا نکل کے گھر سے تو جھونکا ہوا کا تھا

مگر یہاں تو ایک پردہ دار آٹورکشا سے خوشبو کے جھکڑ چل رہے
تھے۔ پوچھا۔ کون ہے۔ کہا۔ ”مریضہ“۔ ”اند آئیے“ کہہ کر میں
مطب میں داخل ہو گیا، بش شرٹ کا کالر درست کیا۔ قلم اور پیڈ کو میز کی
ایک جانب سرکا دیا اور اسٹیٹھسکوپ سنبھال کر بیٹھ گیا۔

ایک جہن پلہ، ایک نیمہ کو جا "مسیم" ہیں پہلایا اسرارہہ۔ لفظہ
 اب جو سر سے پاؤں تک محترمہ کا جائزہ لیا تو پتہ چلا کہ محترمہ قطعاً مریضہ نہیں ہیں
 بلکہ میں خود نزدیس بریک ڈاون کے مرض میں مبتلا ہو چکا ہوں۔۔۔۔ سینکڑوں
 مریضوں کو دیکھا، حسین سے حسین، بد صورت سے بد صورت، پڑوسی لکھی
 فیشن ایبل سے لے کر جاہل اور کنوار تک نظروں سے گزر چکی ہیں، لیکن
 یہاں صورت ہی کچھ اور تھی بقولِ فراق ع۔

سر سے پاؤں تک چہرہ ہی چہرہ
 ایسا پر فرم، ایسا لباس، ایسا میک اپ، جھجک، جرات، سب
 کچھ مل کر ایک مصرعہ بن گیا تھا۔ ع۔

ساغر کیف ہو، پھولوں کا سمندر تم ہو

نام پوچھا، عمر دریافت کی۔ "تکلیف کیا ہے"۔ جواب ملا۔ "دل میں
 درد ہوتا ہے"۔ اختلاج تھا۔ بلڈ پریشر دیکھا، عمر کے لحاظ سے زیادہ تھا۔
 اب میرا اسٹیٹھسکوپ دل کا جائزہ لے رہا تھا۔ میں نے تجویز پیش کی۔۔۔
 "E. C. G. مندرجی ہے، میں ایک پرچی پر لکھے دیتا ہوں۔ فی الحال یہ دوائی
 استعمال کیجئے"۔ ایک چھوٹے سے پیکٹ میں تین گولیاں دے دیں۔ صبح
 دوا پر، شام آدھی گولی بعد غذا۔ نمک کم استعمال کریں۔

محترمہ نے نہیں پوچھی۔ میں نے کہا کہ کوئی بات نہیں۔ پھر دیکھا جا
 وہ آرٹسٹیں۔ ادھر میں بھی مندر پر آ گیا کہ نہیں لوں گا، تو محترمہ نے پندرہ روپے
 میز پر یہ گہ کر رکھ دیئے۔

”اچھا تو آپ کا مجموعہ کلام ”آواز کا رنگ“ کا ایک نسخہ ہی عنایت فرمائیے۔“
 میں مجموعہ کلام کو بال معاوضہ دینا نہ صرف ضروری بلکہ اپنی جائز آمدنی میں شمار
 کرتا ہوں۔ چنانچہ ایک جلد محترمہ کے حوالے کی۔ محترمہ نے کہا: ”اسی پر
 میرا نام لکھ دیجئے۔“ میں نے لکھ دیا اور کہا: ”جب آپ تحفے کے طور پر
 قبول کر رہی ہیں تو معاوضہ کا سوال ہی نہیں رہتا۔ آپ کے روپے واپس
 لے لیجئے۔“ محترمہ نے کہا: ”پھر کبھی لے لوں گی۔“ اور وہ مطلب سے باہر
 نکل گئیں۔ بڑی دیر تک سرد کا عالم رہا۔

ہمارے چھٹی سہ ماہیوں کیسے کیسے

تیسرے دن G.C. نے پورے کرائیں۔ میں نے نسخہ لکھ دیا۔
 وہ بولیں: ”اس اتوار کو پانچ بجے شام غریب خاں تشریف لائے۔ کچھ
 پہلے کلام سننے کی مشتاق ہیں اور رات کا کھانا ہمارے
 سامنے ہے۔“ میرا میرے گھر کا پتہ: ”بغیر کچھ جواب لئے وہ چل دیں
 میں حیران لیکن دل میں خوشی کے فوارے چھوٹ رہے تھے۔ اتوار کو تین دن
 باقی تھے۔ یہ تین دن تین صدیوں میں بدل گئے۔ ایک جمعرات میں کتنی جمعراتیں
 نکل آئیں۔ ایک جمعے میں کتنے جمعے، اور ایک ہفتے میں کتنے ہفتے نکل
 آئے۔ تین صدیوں کے دشت و صحرا سے گذر کر اتوار کی منزل آئی۔ ایک
 شاعر کو دنیا کی سب سے بڑی دولت اس کے سامعین اور مداح ہوتے ہیں
 ویسے یہ مرض بھی بین الاقوامی مرض ہے۔ جب ساری دنیا خوشامد پسند
 تو شاعر کو اس کا نام الہیہ ہے۔ کہہ دوں کہ کھانا لے۔ وہ وہ ہے۔

گما انشا طالب نہیں ہوتا جس قدر داد کا طالب ہوتا ہے۔ اس کے منہ پر اس کا
برا بھلا کہے، یہاں تک دو ادبی گالیاں بھی دے دیجئے وہ سن لے گا
برداشت کر لے گا۔ شرط صرف اس قدر ہے کہ پہلے اس کی ساری شاعری
کی نہیں تو کم از کم کچھ اشعار کی تعریف کر دیجئے۔ میں سمجھ لیجئے کہ آپ
شاعر کے اقلیم دل کو فتح کر لیا ہے۔

تین صدیوں کے بعد آوار آئی تو میں نے اپنا قیمتی سوٹ نکالا، پر
کیا۔ فالن سینٹ کیا بوتل الگ رکھی، بشیو کیا، غسل کیا اور ”رومانی“ کے لئے
روانہ ہو گیا۔ حقیقت میں وہاں اپرٹل کلاس کے فیشن ایبل حضرات و
خواتین کی بھیڑ لگی تھی، ارے، ایسے فیشن ایبل محلے میں اردو شاعری کی
یہ قدر؟ دل کو، آنکھوں کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ خدا خدا کر کے جانبین کا شمار
ہوا اور میں نے زینہ میٹھے شربت کا ایک گھونٹ لے کر غزل کا مطلع پڑھا۔
ہر جن مو پیر کے چاند وہ پیکر تم ہو
ساغر کیف ہو، چسپو لوں کا سمندر ہم ہو

تعریف سچیت بھی جا رہی تھی۔ اسی طرح ساری غزل کا استقبال ہوا
خوشی کے مارے میں چسپو لا نہیں سہا رہا تھا کہ کیسے باذوق سامعین ملے ہیں
ابھی داد کا سلسلہ ختم نہیں ہوا تھا کہ ایک محترمہ نے چیخ کر کہا۔
”لیجئے، مے نوشن شاید نگری ہی آگئے اب اور لطف آئے گا۔“

میں خوب جانتا تھا کہ موصوف خاص شاعرۃ نہیں ہیں ترنم بلا کا ہے
مرکب لیتے ہیں تو گردن کی ساری دگن تن جاتی ہیں اور سارا بدن تھر تھرا نے

لکھا ہے۔ اچھے آدمی ہیں، خلد المذاہی، لم کو، اس وقت کے ایسے آدمی ہیں۔
 محمد حسین آزاد مرحوم ان کی شاعری ان کا آدوہ ہے۔ ان کے منہ میں چونگا ان
 اپنا نہیں کسی اور کا دیا ہوا ہے۔ کئی مہینہ نہیں شہس، اس کا شریفانہ
 کو بحسن و خوبی انجام دیتے ہیں۔ بہر حال مے نوش صاحب شروع ہوئے تو
 داد کا وہی عالم تھا جس پر کچھ دیر پہلے مجھے ناز تھا۔ بات اب سمجھ میں آئی۔
 کلام نوازی کے اختتام پر ڈائینگ روم پہنچے۔ اچھے اچھے ہاتھ اچھی اچھی
 ڈشیں تقسیم کرتے رہے۔ کچھ لوگ اس بے سے فائدہ اٹھا کر اپنی اپنی رکابیا
 بھر لیں اور دور چین میں میزوں کے اطراف کرسیوں پر جم گئے۔ میں نے بھی
 ایک حلقہ پیدا کر لیا تھا۔ میں ذرا احتیاط پسند اور انصاف پسند ہوں،
 دو خواتین، ان کے دو شوہر اور اپنی خاص میزبان کے ساتھ ایک گول میز کے
 گرد ہم لوگ بیٹھ گئے تھے۔ میں نے ہلکے سے طنز کے ساتھ ایک جملہ کہا۔ وہ
 سب طنز کو سمجھ نہ پائے اور مجھے جواب مل گیا۔ میں نے کہا تھا۔
 ”کم از کم آپ حضرات میں اردو کے تعلق سے ایسا جذبہ قابلِ قدر ہے
 پکچر نہیں دیکھی، کلب نہیں گئے۔ ایک مشاعرہ ہی کرا لیا۔“
 یک لخت سبھوں نے میری ہاں میں ہاں ملا دی۔ بالکل بالکل آپ
 سچ فرماتے ہیں۔ اس میں بگڑنا بھی کیا ہے ہمارا۔ گھر میں نہ کھایا، یہاں کھالیا اور
 سننے کو شاعری مل گئی۔ پکچر جانا، کلب جانا تو روز کا کام ہے ہی۔ آج کچھ
 پروگرام بدل دیا بس مزا آگیا۔ مزا تو ان کو آیا لیکن میں خفیف ہو گیا اور میرے
 دل میں ان کے ادبی ذوق پر آنکھ بھی آئی۔

کریا اناک سدا ر ہوا اور وقت ہمارا کام آئے۔ سو چاہا، غزل
دو دن بعد بنائیں گے لیکن کسی طرح ایک ہفتہ ٹل گیا۔

ادھر سے ایک شکریے کا خط ایک چیک رجسٹرڈ پوسٹ کے ذریعے
ملے۔ زندگی میں پہلی مرتبہ "محنت کا معاوضہ" ایک حسین خاتون سے ملا تھا
جی خوش ہو گیا۔ اس وقت میں ساتویں آسمان پر تھا۔

ادھر شیر کے منہ کو خون لگ گیا۔ یکے بعد دیگرے ساری غزلیں
ختم ہوئیں۔ نو دس ماہ میں دیوان تیار تھا۔ میں نے احتیاط یہ برقی تھی کہ ہر
آٹھویں دن صرف ایک غزل کی اصلاح کر کے بھیجتا ورنہ مجھٹ کرتا تو ہر مہینہ
تھا کہ دو غزلوں کا معاوضہ ایک ہی چیک پر مل جاتا۔

مجموعہ کلام شائع ہوا۔ وہ دھوم کا جلسہ منعقد ہوا۔ چار تو منسٹر تھے :
دس آئی اے، ایس آفیسرز۔ سینکڑوں شاعر و شاعرات، کئی نقادانِ فن
جن کے محدود میں اسکاچ و ہسکی کے چار چار پگ تھے۔ سامعین سے ہال
کچا کچھ بھرا ہوا۔ ساری بارات کی دولہن ہماری عزیز شاگرد شاعرہ، پھولوں
سے لدی شاخ گل لجائی جا رہی ہے۔ ہر دس منٹ سے اس کی اسٹیمائنگ
اس کے برابر میں بیٹھیں لیکن ہم اس کے روبرو بیٹھنے پر مصر۔ سامنے بیٹھنے
میں افادیت یہ ہے کہ غزل کے منہ سے غزل سن سکتے ہیں۔ آواز تو تھی ہی اپنی۔
نقادوں نے آسمان لہر پر اٹھالیا۔ یہ سب نقاد میرے جانی دوست تھے،
کھانے پینے آمد و رفت کے اخراجات کے علاوہ ایک ایک سو روپے لے کر
آئے تھے۔ کسی نے کہا :

”مختصر سا رہنا۔ مثلاً یہاں ”غزوہ ادا“ لکھا ہے۔“ کسی نے کہا :
 ”جدیدیت کی علم بردار ہیں۔“ ”نہیں۔“ ”جتنے بارے کے کلاسک رہ گئے
 کئی ورثہ دار ہیں۔“ کسی نے کہا : ”ہندوپاک کی ساری شاعرات میں سب سے
 زیادہ سماجی شعور صرف محترمہ ہی کے ہاں ملتا ہے۔“ اس جملے پر ایک جدیدیت
 کے حامی نقاد بگڑ گئے۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔

محترمہ نے ایک سو پھولوں کے ہار بنوائے تھے۔ یہ کام میرے ایک
 دوست بہود داؤر نے انجام دیا تھا۔ موقع سے فائدہ اٹھا کر انھوں نے
 مختلف انجمنوں اور شخصیتوں کی جانب سے صرف پچھتر ہار پہنا دیئے مابقی
 رقم جیب میں رکھ لی۔ جلسہ درخواست ہوا تو محترمہ نے میرے کان میں چپکے
 سے کہا :

”ڈاکٹر صاحب آپ کے دوست نے پچیس ہاروں کے پیسے بچائے
 میں ابتدا ہی سے ہاروں کو برابر گن رہی ہوں۔“ میں نے کہا :
 ”آج خوشی کے موقع پر خاموش ہو جائیے۔ اس کا شکریہ ادا
 کیجئے۔ پچیس ہاروں کی رقم اور ایک مسکراہٹ انعام میں دے دیجئے۔“
 اب محترمہ کے قلم کے منہ کو خون لگ گیا تھا۔ دوسرا مجموعہ شائع
 کرنے کا ارادہ ہوا۔ ایک سے ان کی کیا تسکین ہو سکتی تھی۔ میں نے کہا :
 وقفہ دیجئے۔ اس قدر جلد بازی ٹھیک نہیں ہے۔ پہلے آپ ان سو غزلوں
 کو صحیح تلفظ کے ساتھ پڑھنے کی مشق جاری رکھیے۔ جب کامل عبور ہو جائے
 تو میں ایک دوسرا مجموعہ کلام نورس ماہ میں پیش کر سکتا ہوں۔ میں بھی

تھک چکا ہوں۔ آپ بھی تھک گئی ہیں۔ ہم پہاڑی کی پوٹلی سر کر چکے ہیں اب سلامتی کے ساتھ دوسری جانب اترنا ہے۔ چڑھنے سے زیادہ اترنا مشکل کام ہے۔ ہر لمحہ پاؤں پھسلنے کا اندیشہ رہتا ہے۔ قدم سنبھال کر رکھنا ہوگا۔ احتیاط کا تقاضہ یہی ہے کیونکہ احتیاط کو ہالائے طاق رکھنے کی عمر تو گئی۔“

فی الحال وہ مان گئی ہیں۔ اب بغیر غزال کے بھی چک و صول ہوتے ہیں کبھی کبھی مجھے خود جا کر چک حاصل کرنا پڑتا ہے۔ لیکن اس کا رطیفہ کو میں نے عام نہیں کیا ہے۔ ایک ہی پر شاگرد صاحبزادہ قانع ہوں۔ محترمہ پر کئی حضرات نے جال پھینکے لیکن وہ کبھی تکنت سے، کبھی محبت سے معذرت کر کے بچ جاتی ہیں۔

تصنیف کا ردِ عمل

تلگو نثری شاعری کا پہلا نثری اردو ترجمہ میں نظموں پر مشتمل تھا۔
یہ میرا پہلا تخلیقی ترجمہ تھا۔ شائع ہوا تو میں بے حد خوش ہوا۔ چلو اب میں بھی
”اپنی کتاب“ ہو گیا۔

دس جلدیں بیاباگ میں رکھ لیں، ایک دوست کے گھر جا پہنچا۔ مولانا
مہر الدین غزنوی شاہ۔ ایک نسخہ ان کی نذر کیا۔ اُمید تھی کہ قدیم دوست میں
”مبارک مبارک“ کہہ اٹھیں گے۔ بخل گیر ہوں گے۔ دیوان خانے کی
کھر لکی سے جھانک کر اپنی اہلیہ سے کہیں گے:

”بھئی۔ چائے بسکٹ اور کچھ مٹھائی بھجھو، ہمارے قدیم دوست
غیاث صدیقی آئے ہیں۔ یہ آج سے صاحبِ کتاب ہو گئے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ“
اگر وہ اس طرح کے کام کرے گا، تو اس طرح کے کام کرے گا۔

مردیار اپنا نام پسندیدہ لکھنا مجبوراً طے پڑ رہا ہو اور اسے ہمارے ہاں کوئی کڑاوی
کی زحمت ہو رہی ہو۔ خدا خدا کر کے منہ سے چھوٹے۔

”بھئی۔ یہ نثری شاعری تو میری سمجھ سے باہر ہے۔ اسے شاعری

کیسے کہا جاسکتا ہے۔ نہ وزن، نہ قافیہ، نہ ردیف، قلم اٹھاؤ ہو چاہو
لکھ ڈالو۔“ میں نے عرض کی: ”مولانا ضوفشاں، ناسخ کا ایک شعر سنئے“:

جو اُس پری سے شبِ وصل میں رکاوٹ ہو

مجھے بھی ایک جنازہ ہو یا چھپر کھٹ ہو

اور میری نثری شاعری کا نمونہ بھی ملاحظہ ہو۔

”تم ایک حسین حادثے کی جان ہو

جو میری ہزاروں رنگین

ایک آنکھ بن کر جاگ رہی ہو۔“

ناسخ کے اوپر والے شعر میں وزن، قافیہ، ردیف ہیں۔ عروض

مردجہ کے مطابق یہ غزل کا ایک مطلع ہے لیکن اس میں شاعری یا نغمی کہاں

ہے۔ شاعری کا (Spark) کہاں ہے۔ لیکن میری نثر میں وہ (Spark)

موجود ہے۔ اس کے علاوہ پابند شاعری میں قافیہ، ردیف، اور بحر کی پابندی

جان لیوا ہوتی ہے۔ قافیہ، ردیف اور وزن کو سنبھالنے میں حشو اور تاخیر

و تقدیم کا شکار ہونا پڑتا ہے۔ بڑے سے بڑا قادر الکلام بھی حشو، تاخیر

اور تقدیم سے نہیں بچا ہے لیکن نثری شاعری میں کوئی بہانہ نہیں چل سکتا۔

نقاد کی گرفت مضبوط ہو جاتی ہے، اور شاعر ہر لفظ کو شعوری طور پر ناگزیر

سمجھ کر استعمال کرتا ہے۔ نہ قافیہ ردیف کا بہانہ اٹھ چا سکتا ہے نہ بحر کا
 سہارا سپہر بن کر نقاد کے وار کو روک سکتا ہے۔ ایک ایک لفظ شعوری
 طور پر استعمال کرنا پڑتا ہے اور ایک ایک لفظ کا حساب نقاد لیتا ہے
 تخلیق میں جس قدر آزادی دی جائے گی تنقید اسی قدر کس کر کی جائے گی
 اس لئے نثری شاعری ہی میری نظر میں نہایت مشکل اور فطری تخلیق کہلائی
 جاسکتی ہے۔ حالی ہشتی کے علاوہ اردو اور انگریزی کے اعلیٰ درجے کے
 نقادوں نے شعر کے لئے وزن کو لازم نہیں قرار دیا ہے مگر تخیل اعلیٰ درجے
 کا ہو، اظہار خیال کے لئے الفاظ میں حشو نہ ہو اور شاعر عجز کلام یا عدم
 قدرت بیان کا شکار نہ ہوا ہو، اور عروض کی پابندی کی جائے تو ایسا شعر
 موزوں، سونے پر سہاگہ کہلائے گا۔ آج کی مشینی تیز رفتار دنیا میں اعلیٰ
 اساتذہ کا خلوص فن، وقت، طالب علم کا حسن طلب اور ریاضت سوالیہ
 نشان بن گئے ہیں۔

مولانا خورشید نے فرما کہا ”غیاث صاحب آپ سے میں
 بحث نہیں کر سکتا۔ ثبوت، دلیل اور علم کا اظہار مجھ سے مشکل ہے مختصر
 یہ کہ نثری شاعری دل کو نہیں بھاتی اور یاد بھی نہیں رکھی جاسکتی ہے۔
 بہر حال اس مجموعہ کلام کی اشاعت پر میں آپ کو مبارک باد دینا ہی بھول
 گیا۔“ چلو چھٹی ہوئی۔ پچیس سالہ دوستی نے مبارک باد کا طمانچہ میری تخلیق
 کے رخسار پر جما ہی دیا۔ دل نے کہا چلو کھوسٹ آدمی ہے۔ شاعری کے
 میدان میں پچیس بیس سال پیچھے ہو۔ یہ مبارک ان سے غیر متوقع نہیں تھا۔

اس مولانا کے ہاں بے اب کہیں اور چلیں۔ اسے ہاں یاد آگیا، اپنے ترقی پسند شاعر خورشید آفاقی کے ہاں چلتے ہیں۔

دروازے پر دستک دی تو نسوانی آواز نے نام پتہ، وجہ ملاقات دریافت کی۔ دس منٹ کے بعد دروازہ کھلا۔ سوکھے مرسل شاعر، چھٹی بنیان، تہمد پر دو چار پیوند، اندر گودھنسی ہوئی آنکھیں، اور آنکھوں میں پیکر بنیاد، گردن تک لمبے لمبے بال، بس سارے تبسم میں سب سے نمایاں چیز بال ہی تھے۔ کالمے بالوں میں مقیش کے تار تیل سے بے نیاز سیاہ ہونٹوں میں چار مینار سگریٹ دبی پھونک جیسے چنگاریاں تھوک رہی ہیں۔ ہاتھ اور مہ ٹوٹی ہوئی گریباں نہیں ایک پر میں بیٹھ گیا۔ دوسری پر مین بان۔

”کہتے غمناک صاحب کیسے آنا ہوا۔“

میں نے ایک نسخہ ان کے ہاتھ میں پیش کر دیا۔ انھوں نے نہایت حقارت کے ساتھ کتاب پر نظر ڈالی۔ کتابت، بیادست و غیر سب کچھ ان کی نظروں میں بچ رہا تھا۔ فوراً مسکرائے۔ ”تبارک، کتاب اچھی چھپی ہے۔ پھر درق گردانی شروع کی۔ ”ناشر کو فی راجست پسند ادارہ معلوم ہوتا ہے“ دو ایک نظمیں پڑھیں۔ پھر مسکرائے۔ ”نظمیں بہت خوبصورت ہیں لیکن ان میں سماجی شعور کم نظر آتا ہے۔ مجھے بے مقصد زندگی اور بے مقصد شاعر بالکل پسند نہیں۔ آپ کے ہاں تو ایک سے ایک بڑھیا توئی نظمیں ہیں۔ ان کو کیوں نہیں چھاپا۔ یہ مجموعہ جس تلگو شاعر کا ہے اس کے ہاں بھی کئی مقصدی

اور قوی نظریں تھیں ان کا انتخاب کیوں نہیں کیا۔ یہ مجھ کو آپ کے قریبی دوستوں کا انتخاب معلوم ہوتا ہے۔ خیر آئندہ دوسری اشاعت میں یا دوسرے مجموعے میں ان اہم نظموں کو ضرور شائع کیجئے۔

اندر سے کالمی پہلی چائے، دو ٹوٹے چھوٹے گلوں میں آئی۔ چائے میں شکر اور دودھ سے زیادہ خلوص تھا۔ پی گیا۔ شکر یہ اور گرم گرم مصلحے کی سوغات لے کر وہاں سے نکلا۔

راہ میں ایک جویہ شاعر کا گھر پرٹنا تھا۔ موصوف "محکم سادھی" کے نام سے مشہور تھے۔ پہلے شاعر کہلائے۔ بعد کو انھوں نے نقاد بننے کی کوشش شروع کر دی۔ حالاں کہ اردو سے ان کا تعلق اس قدر ہے کہ شعرِ مقدمہ شعرِ شاعری یا بغیر خاطر کا ایک صغیر صریح لفظ کے ساتھ نہیں پڑھ سکتے۔ بہر حال ان سے ملاقات ہوئی۔ بڑی خاطر کیا۔ میں نے ایک نسخہ موصوف کو دیا فوراً گلے لپٹ گئے۔ "مبارک، مبارک کیا خوبصورت گٹ اپ ہے۔۔۔" کاغذ، طباعت، کتابت، سرورق کس کس کی تعریف کی جائے۔ سبحان اللہ! ما شاء اللہ، واہ واہ "کتاب نہیں کھوئی تھی۔ میں نے کہا۔

"ذرا پڑھ کے بھی تو دیکھئے ایک اور نظم" انھوں نے درق گردانی کی۔ "غیاث صاحب گو آپ کی شاعری کی عمر میری حقیقی عمر سے زیادہ ہے۔ لیکن شاعری اور ترجمے میں آپ کو نو مشن کہہ سکتا ہوں۔ ارے نئی انقلابات کے بغیر جدید شاعری کیسے ہو سکتی ہے۔ ترشہ، تیزاب، سگریٹ، حسنِ مشام، اور غرض جسے الفاظ و تراکیب کے بغیر جدید شاعری ہو ہی نہیں سکتی۔"

پس اسے پیچوں میں لے بیٹریں میں تمہارا ذکر کیا تھا۔
 میں نے اس کے لب اسٹک کے دھبوں کو اپنی گردن سے ٹھٹھا
 کرنے کے لئے اپنی سفید دستی استعمال کی۔ کچھ دیر وہاں بیٹھا تو تھکن اور گھٹن
 دودھ ہو گئی۔

شام ہو چلی تھی، گھر پہنچا، دیکھا دو حضرات واپس پہ تشریف فرما
 تھے۔ ایک جلد ساز دوسرا مطبع کا ملازم۔ دونوں کے ہاتھوں میں ہلرے تھے۔
 دونوں سے ایک ہفتے کی ہیت لے کر گھر میں داخل ہوا اور پسینہ پونچھنے کو
 دستی نکالی تو بیوی نے پوچھا۔

”اے آپ کی دستی پر یہ خون کے دبے کیسے؟“ میں نے کہا۔ ”چپلے
 کھانا ڈکالو، بھوک بگی ہے۔“

دوسرے دن علی الصبح اخبار میں اپنی تصنیف کی اشاعت سے متعلق
 خبر کو ڈھونڈا کیا۔ سارا اخبار پڑھ ڈالا۔ خبر کہیں نہ ملی۔ ایک جگہ کالم کے
 آخری حصے پر نہایت مختصر تحریر میں پچھڑی سی خبر تھی وہ بھی دو کالموں کے
 آخری حصوں پر مشتمل تھی۔ ویسے میرے نام کی اور مالنگ بھی کی گئی تھی۔
 غیاث صدیقی کے بجائے عنایت صدیقی لکھا تھا۔ یہ عنایت کاتب گئی تھی یا
 ایڈیٹر کے کسی چچے کی خدا کو معلوم۔ میری خبر کے اوپر علی خط میں ایک اور
 خبر تھی۔ اسی اخبار کے ایک پتے پر گزشتہ دنوں کے استعمال و پیچیز
 و تکفین کے خبر صبر کر لیا۔

پندرہ سترہ دن خصوصاً دکنیوں کی بچپن ہی سے ماں باپ جو

پہلا کام مسئلہ مائیں وہ ظلم سہنا اور صبر کرنا ہے۔ ہمارے ہاں
 اور خصوصاً حیدرآباد میں صحافت کی گرفت "ادب" پر بہت مضبوط ہے۔
 "صحافت" ایک تناور درخت ہے تو "ادب" اس کی ایک ٹہنی شاخ
 بن کر رہ گیا ہے۔ اسی شاخ پر ادیب و شاعر و نقاد بیٹھتے ہیں اور صحافت
 کی جانب سے عطا کردہ آکرے سے اسی شاخ کو کاٹنے میں اپنی عمریں صرف
 کر دیتے ہیں۔

ادبی ڈکٹیٹر

میں ایک روز نامے کا ایڈیٹر ہوں، اگر ہفتے میں ایک بار ادبی ایڈیشن نکالوں تو ہفتہ وار کا ایڈیٹر کہلاتا ہوں اور چھپنے میں ایک مرتبہ ایک نیم ادبی اور نیم فلمی سرپرست نکالوں تو ماہنامے کا ایڈیٹر بن جاتا ہوں۔ اس طرح میری پانچوں انگلیاں گچی میں ہوتی ہیں۔ ایڈیٹر بننے میں بڑے فائدے ہیں۔ قدیم زمانے میں لوگ لائیس کے امین سے جس طرح ڈرتے تھے آج روز نامے کے ایڈیٹر سے ڈرتے ہیں۔ ویسے بھی میں اپنے ملک (دفتر) کا بادشاہ ہوں۔

آج کا سب سے بڑا ہندوستانی مرض، بین الاقوامی مرض، شہرت کا مرض ہے، اور ظاہر ہے کہ میں اس مرض کا علاج آسانی سے کر سکتا ہوں۔ میرے قلم کی نوک پر حیات و ممات کی شہرت کا انحصار ہوتا ہے۔ میں نے جسے چاہا تو میں، زندہ رہ کر دیا، جسے چاہا آسمان پر پہنچا دیا۔

فرصت کے لئے سب سب ہوتی ہے۔ سارے شہر کی چٹائی
 کرنے کے بعد میرے بچے بچے یقین والے تھے کہ لیڈر، تاجر، پروفیسر، ادیب
 شاعر، اور دانشور تک اپنی تصاویر اور اپنے کارنامے لے کر میرے دفتر
 چلا آتے ہیں۔ سب کے سب شہرت کے مریض اور میں ان کا "تارامیخ"
 پچیس روپے میں جنت کی سیر کرا دیتا ہوں۔
 زمین پر تو میری تصویر تھا جو آسمانوں میں

بہت کم ایسے ہوں گے جو کہیں گے۔

گلو کے عشق کو دارورسن پہنچ نہ سکے
 تو ٹوٹ آئے نرے سر بلند کیا کرتے

میرا مسلک غیر جانب داری ہے۔ چرچل نے غیر جانب داری پر
 عجیب تبصرہ کیا تھا۔

"باضمیر اور باشعور آدمی، ظالم اور مظلوم میں فرق کرتا ہے۔ ہر مظلوم کا
 ساتھ دیتا ہے لیکن بے ضمیر یا بے شعور یا تو ظالم کا ساتھ دیتا ہے یا سکڑا اور
 غیر جانب دار بن جاتا ہے۔ اب آپ کچھ بھی سمجھ میں تو ایڈیٹر ہوں، دو لیڈروں
 کے متضاد بیانات پیش کرتا ہوں یا دو مدعیوں کے اشتہارات ایک ہی زمین
 کے تعلق سے ایک دوسرے سے منسلک شائع کرتا ہوں۔ مجھے درم و دام سے
 غرض ہے۔ کاتب، خوش نویس، کلرک، چیراسی اور کئی سب ایڈیٹروں کی
 محنت، خون پینہ، اُن کا تجربہ اور علم صحافت، میرے لئے نشان دار مکان
 خوب صورت لمبی موٹریں، تعیش اور آرام دہ زندگی فراہم کرتے ہیں اس عمل

کو استعمال یا مجبور عوام کا خون چوسنا نہیں کہتے بلکہ عوام مجھے اس عمل سے
 ہائز حق دار سمجھ کر میری صدارت میں ادبی جلسے کرتے ہیں اور میرے ہاتھوں
 اعلیٰ عدجے کی ادبی کتابوں کی رسم اجرا بھی انجام پاتی ہے۔ رسم اجرا کے
 وقت جو مضمون پڑھنا ہوتا ہے وہ کسی سب ایڈیٹر کا لکھا ہوتا ہے۔ وہ
 بے چارہ سب ایڈیٹر مضمون تو لکھ دیتا ہے لیکن ہر لفظ کو احزاب لگا کر صحیح
 تلفظ۔ صیح آواز کرنے کی جرات کیسے کر سکتا ہے۔ میں بھی پوچھنے ہوئے
 ہوتا ہوں۔ یہیں میری عظمیٰ ایڈیٹر کی قلعی کھل جاتی ہے کیا کروں جب کسی
 مفاد کو اضافت کے ساتھ پڑھ دیتا ہوں تو پڑھے لکھے لوگ منہ پھیر کر
 سگراتے ہیں۔ بڑے بڑے نقاد تو میری جیب میں رکھے ہیں۔ ان کے
 ضمیر ان کے شاندار مستقبل کے تلے دبے پڑے ہیں اگر وہ میرے خلاف
 علامہ منہ کھولیں تو میں یونیورسٹی میں بھی با اثر ہوں وہاں ان کی حقیت کے
 پاؤں آگے بڑھنے سے پہلے ہی کاٹ دے سکتا ہوں۔ میرے وفاداروں
 ان ادیب، شاعر، اعلیٰ عہدہ دار، بڑے بڑے لیڈر اور دانشور تک
 ہیں۔ ان کی دعوئوں پر کیا خرچ اٹھاتا ہے، ان کے اپنے اختیارات سے ہزاروں
 روپے کے اشتہار مجھے مل جاتے ہیں

میرے اخبار کا پالیسی نظام مسکوکہ ہے لیکن مذہبی فسادات کی
 جہد پر عملی سطح میں سرخیاں لگا کر مذہبی لیڈروں کو خوش کرتے ہیں اور
 مظلوم و مجبور مزدوروں پر حکومت کی زیادتیوں کی خبریں خطِ حقی میں شائع
 کر کے حکومت کے ارباب مقتدر پر منظرِ نظر بن جاتا ہوں۔

پیرس میں ایک سفر سے ملنے کا وعدہ تھا، خیال فرمے گا اکیلا
 لیکن دوست احباب کی ضد نے مجھے حج کر لینے پر مائل کر کے ہی چھوڑا۔
 حج کرنے میں بڑے فائدے ہیں۔ نام کے ساتھ الحاج لکھ جاتا ہے اور مذہبی
 جماعتوں، جلسوں، اور مشاعروں کی عداوت ہاتھ آتی ہے۔ اب تک تو میں
 اپنے چچوں کو سیکولر اسٹیج سے پیش کرتا رہا تھا اب الحاج ہونے کے بعد
 مذہبی اسٹیجوں سے بھی لپٹنے چچوں کو چمکا سکتا ہوں۔ میری مذہبی اداکاری
 پر لوگ تنقید کرتے ہیں تو وہ تنقید ہوٹلوں اور گھروں تک محدود رہ جاتی
 ہے۔ کوئی بڑا اخبار میرے خلاف لکھنے کی جسارت نہیں کر سکتا۔ گذشتہ
 ہفتے ایک معمولی ہفتہ وار میں لکھا تھا کہ الحاج غلام (یعنی میرا نام لکھ کر)
 ناخن نہیں تراشتا۔ انگلیوں کے ناخن میل بھر کر سیاہ ہلال بن جاتے ہیں
 اس طرح وضو نہیں ہو سکتا تو نماز کس طرح ادا ہو سکتی ہے۔ حالانکہ میں نے
 اسی حالت میں وضو بھی کیا ہے۔ نماز بھی پڑھی ہے، اور نماز ادا بھی ہوئی ہے
 مجھ پر تنقید تو ہوئی لیکن کسی بڑے اخبار نے نوٹس نہیں لی۔ مگر میں نے احتیاط
 شروع کر دی ہے۔ اب کم از کم بظاہر پاک عادتیں بنالی ہیں۔ رخی (جوا)
 اور کلب چھوڑ چکا ہوں۔ پھر بھی قیمتی شرابیں گھر میں رکھنی ہی پڑتی ہیں تاکہ دائرہ
 طبقہ کی مقدس تواضع کی جاسکے۔ میرے جاسوس چچے سارے شہر کا احاطہ
 کئے ہوئے ہیں۔ کئی ادبی انجمنوں میں سیاسی پارٹیوں میں، مذہبی کمیٹیوں میں
 تک میرے وفادار معرود ہیں۔ شہر کے سب سے بڑے مشاعروں کی فہرست
 میں مرتب کرتا ہوں۔ لیکن مشاعرے کا کنوینر اپنے کسی چچے کو مقرر کرتا ہوں۔

فہرست میں اس بات کا خیال رکھتا ہوں جو میری کفایت ببادری کر سکیں میرے
 اشاروں پر ناچیں، وہ اس قدر نکمے ہوں کہ ان کو میری سفارش، میری دوست
 اور میرے اخبار کی شہرت ہر وقت درکار ہیں وہ کسی میدان میں کبھی خود کتنی
 نہ ہو سکیں ایسے ہی شاعروں کو میں صنفِ اول میں جگہ دے کر اس قدر پروپیگنڈا
 کرتا ہوں کہ گاؤں گاؤں ان کی شہرت ہو جاتی ہے، اور ان کی مارکٹ ریٹ
 بڑھ جاتی ہے۔ میں اپنے فرض میں کوتاہی نہیں کرتا لیکن اس کو کیا کروں کہ کم بخت
 قریہ قریہ شاعرے پڑھتے ہیں، عوام سے روپے بٹورتے ہیں۔ سگریٹ، پان
 شراب کی فرمائشیں کرتے ہیں، مگر شاعروں میں یا ادبی گفتگو میں خود کو جاہل
 ثابت کر کے لوٹ آتے ہیں۔ اس طرح دوسرے شاعروں میں مجھے ناموں کی
 قیاس بدلتی پڑتی ہے۔

پڑتے دیکھ لوگ کہتے ہیں کہ "میں اُمراؤ میں دس صحیح جملے نہ
 بکھڑکتا ہوں نہ پڑھ سکتا ہوں نہ بول سکتا ہوں۔" مگر
 ان کی آواز بقدر خانے میں طوطی کی فریاد بن جاتی ہے۔
 یہ تو میری زندگی کا ایک رخ ہوا۔ اب دوسرا رخ بھی ملاحظہ فرمائیے
 کہ میں کتنا عجیب ہوں اور کتنا مختار ہوں۔

میں بہت بڑھا لکھا نہیں ہوں لیکن اچھے بُرے کی تمیز ضرور رکھتا
 ہوں۔ ایک صاحب قریبی عزیز ہیں۔ بس ایک پھسکی سی غزل لے کر چلے
 آئے۔ سُرقت کے مارے غزل بھی چھاپ دی اور محافضہ بھی دے دیا۔
 ایک شاعر، مکمل شاعر، یعنی شراب، لمبے بالوں اور ترنم کی جیسا کہ یوں پر

آئے ہیں، ہر بڑے شاعر سے میں شرکت کرنا پسند کرتا تھا۔ بڑی شاعر (یعنی میرے چچوں کی سفارشیں) لے کر آتے ہیں، مجبوراً ان کو شاعر سے میں شرکت کی دعوت دینا پڑتا ہے۔ میں جانتا ہوں وہ شاعر، شاعر کے اختتام پر بڑے فخر سے سینہ تان کر عام لوگوں میں کہتے پھریں گے کہ ان کے بغیر شاعر ہی منعقد نہیں ہو سکتا تھا۔ ان کی جھوٹ صرف شیخی کی حد تک ہے۔ بمبئی میں شاعر بڑھے، لکھنؤ میں، کشمیر میں اور آخر کو بی بی سے بھی شاعر بڑھنے کے دعوے دار بن جاتے ہیں۔ اپنے اساتذہ میں فانی، جگر سے لے کر اقبال تک کو گنواتے ہیں۔ موصوف بہت مریدان بھی اور بے ضرر شریف آدمی ہیں۔ ان کی شخصیت سے شاعری اور شہرت کی جھوک کو علیحدہ کر دیا جائے تو دستوں کو ٹوٹ کر چاہنے والا آدمی سامنے آ جاتا ہے۔ شاعر کو شیخی کی چھوٹ تو دینی ہی چاہیے۔ دیے یہ بھی میرے ایک چچے کے لے پالک ہیں اس کی دم کے پیچھے لگے رہتے ہیں۔ ان کی عدم موجودگی میں ہر شخص ان کی علمیت پر ہنستا ہے۔ ان کے متعلق دو رائیں نہیں ہیں۔ میلہ دفتر ایک کا سودا ہادی دفتر ہے۔ یہاں نوابوں اور جنگ وولہ کی اولاد کے لئے دیوان خانہ کہاں سے لادیں۔ کچھ مرحوم نوابوں کی اولاد بے منزل اور کچھ نام نہاد خاندانی حضرات میرے دفتر کو خال کاٹ کر اسلام آباد جاتے ہیں کہ سارا اخفیہ کاروبار محفل ہو جاتا ہے۔ یہاں میری مریت اور وسیع القابلی کام اتنی ہے برداشت کر لیتا ہوں۔

میرے دفتر میں خوب صورت خواتین، شاعرات بن کر آتی ہیں اور

شاعروں میں شرکت کے لئے اپنا نام اور بیاسی دل بھی پیش کر رہی ہیں۔ چہرہ
انہیں مدعو کرنا پڑتا ہے اور میں بھی انتقاماً ان کو مشاعرے کے اسٹیج پر
دھماکانے کی دھمکیاں دیتا ہوں۔ مہمانِ ادھر خوش، شاعر آ
ادھر خوش۔ میرا کیا بگڑتا ہے۔

آج انسان کچھ نہ ہو صرف ایک روزنامے کا ایڈیٹر بن جائے تو
سمجھے سب کچھ ہو چکا۔ کبھی میں ربر کی چیلین پاؤں میں ڈال دیتا ہوں تو ٹی پھوٹی
سائیکل گھسیٹتا پھرتا تھا۔ اشتہارات کے لئے اور چندوں کے لئے جن کے
سامنے جھولی پھیلاتا تھا، آج میں ان کے سلام کا منتظر رہتا ہوں، اگر وہ
سلام میں پہل کرتے ہیں تو میں فارن سگریٹ ہونٹوں میں دبا کر صرف
سر ہلا دیتا ہوں۔

میرے بچے میرے ماضی سے واقف نہیں ہیں، بیوی واقف ہے
بھول جانا چاہتی ہے۔ رشتے دار، عزیز، میری امارت ہر دلعزیزی اور
شہرت سے مرعوب ہیں۔ ادب مجھ سے قربت ہونے پر فخر کرتے ہیں۔
بعض مرتبہ آفسروں کی خوشامد خوب محنت کرنی پڑتی ہے۔ ان کی تصویر
سولج حیات اور ان کے کارنامے شائع کرنے پڑتے ہیں۔ اور ان کو بڑا ادیب
بھی ثابت کرنا پڑتا ہے یہی سلوک مجھ اپنے لئے مفید شاعروں، ادیبوں
نقادوں اور دانشوروں کے ساتھ کرنا پڑتا ہے، اور یہیں میرا ضمیر مجروح
ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اس طرح میں ادب کی ایک جھوٹی تاریخ مرتب کرتا ہوں۔
در خیال آتا ہے آنے والے محققین مجھے گالیاں دیں گے۔ ابن الوقت ٹھہرائیں گے

مجھے ہندو در اور بالمشیر جا مل ثابت کریں گے۔ یہیں میرے قدم ڈگمگاتے ہیں
 اللہ کا احسان ہے کہ میرا ضمیر ابھی زندہ ہے اور میں اپنی کوتاہیوں، نا انصافیوں
 اور زیادتیوں کو محسوس کرتا ہوں۔ میرا ضمیر صرف اس وجہ سے زندہ ہو گا کہ
 میری رگوں میں بزرگانِ ملت اور شرفائے شہر کا خون رواں دواں ہے۔
 کاش جس اس کو ایسا موقع ملتا ہے کہ میں مرنے سے پہلے نقادوں اور
 دانشوروں کو ان کے ضمیر لوٹا سکوں۔ میرے احسانات کے تلے ان کی
 دبی ہوئی زبان کو قوتِ گویائی داپس کر دوں تاکہ اپنے کئے پر پہلے سارے ادبی
 جہانم کا کفارہ ادا ہو جائے۔ اور میں ادب کی جھوٹی تاریخ مرتب کرنے والا گنہگار
 نہ کہلواؤں۔ خدا کے فضل و کرم سے مجھے دولت، عزت، شہرت سب کچھ
 مل چکا ہے۔ مستقبل کا مورخ ادب مجھے ضمیر فرشتے جیسی پائنا شناس ادب
 کے غلط بات نہ عطا کرے۔

میرے مالک! مرنے سے پہلے مجھے ایک موقع عطا فرما کہ میں اپنے
 دامن سے ”چچہ نوازی“ خوش آمد پسند، ”خوار نوازی“ اور ادبی ڈکٹیٹری
 کے سیاہ و بھور ڈالوں۔ اور ادب کے ڈکٹیٹری بجائے ادب کا ادنیٰ خدمت
 گزار کہلواؤں۔

سورج مکی

میں ایک اخبار کے ایڈیٹر اور جوائنٹ ایڈیٹر کا پتہ ہوں۔
 ان کا رخ جس طرف ہوتا ہے میں بھی اسی سمت اپنا چہرہ گھماتا رہتا ہوں
 اور تابعداری کے لئے ہمیشہ ان کے روبرو سر جھکا کر بات کرتا ہوں۔ یہ کہتا
 رہتا ہوں کہ اس نے مجھے سب لوگ "سورج مکی" کہتے ہیں۔ تجھے میں
 خطاب دینے والوں کی اکثریت ادیبوں، صحافیوں، شاعروں اور دانشوروں
 کی ہے۔ حالانکہ میں جو کام کھل کر، علانیہ کرتا ہوں وہ کام تجھے خطاب
 دینے والے افراد تو ہیں پمپ، پمپ کر یا ایڈیٹر کے کمرے میں کیا
 کرتے ہیں۔ اب آپ ہی فیصلہ کریں کہ میں ریاکار ہوں یا تجھے یہ خطاب
 دینے والے ؟

میں "ایک درگزر و محکم گیر" کا قائل ہوں۔ میں نے ایسے ایڈیٹر کو

پہانس لیا سوتہ جو سارے مہاں کا شکاری جڑے۔ میرے مددگار
 پاس (بے حساب) دولت ہے۔ کئی مذہبی، لسانی، اور ادبی ٹرسٹوں
 کا سرپرست ہے۔ عوام کو اور حکومت کو اپنی شرافت اور حب الوطنی
 کا یقین دلانے کے لئے ایک جمہوری طریقہ ہے وہ یہ کہ پردے پر دسے
 میں ہلاک مار کٹنگ کرو، غبن کرو، جمہوریت کے پردے میں کالیڈاٹ
 یا بادشاہیت یا نوابیت چلاؤ، لیکن ظاہر داری میں بگلا جھگٹا بنے رہو
 کچھ مذہبی، کچھ لسانی، کچھ ادبی ٹرسٹوں کے لئے رقم جمع کرو، اور ٹرسٹ
 پر ٹرسٹ بناتے جاؤ۔ اخبار اپنا، اشتہار اپنا، پروپیگنڈا اپنا۔ اور
 کیا چاہیے؟

میرا اصلی کام سراغ رسانی اور چیل خوری ہے۔ میں ان کے کفش
 برداروں کا کفش بردار ہوں۔ اپنے مالک کے مخالفوں کی فہرست بنا کر
 کام شروع کرتا ہوں۔ مخالفین نے ایک کہا تو میں اس کو اپنی صلاحیت
 صفر لگا کر دس کر دیتا ہوں۔ پھر ایڈیٹر اور جوائنٹ ایڈیٹر کے
 روبرو اپنا رپورٹاژ (چیل خوری) پیش کر کے ان کو کس قدر خوش کر دیتا ہوں
 اس کا اندازہ کرنے کے لئے میرے ضمیر سے میری بیب تک آپ کو دعا
 اور مادی سفر کرنا پڑے گا۔

کچھ سال قبل میرے چہرے پر ایگزیکٹو کی وجہ سے سیاہی آگئی تھی
 شہر کا ہر شخص کہنے لگا کہ یہ سیاہی میری چیل خوری کا اور دشنام طرازی
 کا نتیجہ ہے۔

میرا فن، میرا ایمان ہے۔
اس دنیا میں تو میں مگن ہوں اور کامیاب ہوں۔

عاقبت کی خبر خدا جانے

میری تخلیقات تیسرے درجے کی ہیں لیکن مجھے پہلے درجے کا
اسٹیج حاصل ہے۔ چیز بان اور تہان و الشور میری تخلیق پر ہفتہ میں
لیکن میرے مجازی مالکین کے سامنے میرا پول نہیں کھولتے۔ اس کے
لئے میں مختلف قسم کے حربے استعمال کرتا ہوں جن کا انکشاف نہ صرف
میرے لئے مفید ہے بلکہ یہ خوف ہے کہ آئندہ مجھ جیسی نسلوں کے لئے
بھی سب راستے بند ہو جائیں گے۔ کیوں؟ کیا مجھ جیسے لوگوں کو آئندہ
پیدا نہ ہونا چاہیے؟

گلاب سنگ رنگ سے ہے زینت چمن

اے ذوق اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

اس شعر کو پڑھ کر آپ کہیں گے حدیث شریف کی طرف اشارہ ہے۔
”اہل بیت کے علمائیں اختلاف دین کی اشاعت کا باعث بنا سکتا ہے۔“

اور سٹ۔ لیکن مجھے اعلیٰ مضامین و مفاہیم نکالنے کی نہ ضرورت ہے نہ
فرصت، مجازی مالکین کی خدمت (چفل خوری) سے فرصت ہو تو حقیقی
مالک کی طرف دھیان دینا ہے۔ سکتا ہوں۔ میرے درجے کے
بعد مجازی مالکین نے میرے لئے ایک گنبد بنانے کا بھی یقین دیا ہے
انشاء اللہ۔ کبھی نہ کبھی سورج مکھی گنبد فطرت کے لئے بھی ہمارا اخبار

ماننے پہ ابھرائی سہ دل کی مالک (ناغ)

میں نے اپنے کارناموں میں پچاس فی صدی کمی کر دی ہے، یعنی
 "گالیاں دینا" چھوڑ دیا ہے۔ دیکھئے اللہ (ایڈیٹر) کے فضل سے
 میرے چہرے سے نصف سیاہی چھٹ چکی ہے۔ گالیاں دینا دراصل
 میں نے بچپن میں اپنے ماحول سے سیکھا تھا۔ بڑے سے بڑے آدمی
 کو بھی نہایت دریدہ دہنی سے بڑی سے بڑی گالی دے سکتا ہوں۔
 اس فن کے لئے ایڈیٹر اور جوائنٹ ایڈیٹر کو مطلوب مت کیجئے،
 اگر میرے مالکین کے خلاف میرا باپ بھی کچھ کہے تو وہ بھی وہی گالی سنے گا
 جو دوسرے سنتے ہیں۔

میرے مجازی مالکین کے حکم پر میں کسی کے خلاف پروسیکٹڈ
 کرتا ہوں۔ لٹے سے سرشار نعت سنانے والے گوئیے کو شراب
 کی ایک پیگ والی سیل بند شیشی پیش کر سکتا ہوں کسی بڑے آدمی کے
 دائیں بائیں حسیناؤں کو ڈھکیں سکتا ہوں۔

پھر مجھے اندرون ریاست اور بیرون ریاست کے مشاعرے اورد
 ان کے بڑے بڑے معاوضے ہاتھ آتے ہیں۔ اخبار میں میرا نام ایک ماہ
 میں کم از کم پندرہ دنوں تک مختلف کارناموں کی وابستگی کے ساتھ چھپتا
 رہتا ہے۔

ہر بڑے آفیسر کو سلام مارنا، ان کے ناموں کو ادبی اسٹیجوں کی
 زینت بنانا، شہرت دینا، اخبار سے ان کا قریبی ربط رکھنا میرا پیشہ

عظیم بیج کے لئے

میرے ایڈیٹر کو ادبی مجلسوں کی صدارت اور ادبی کاناموں کی
رو نمائی کا بڑا شوق ہے۔ اس کے لئے مجھے بڑے پاڑے بیٹے پڑتے ہیں
مخالفین کو قریب کرنا ان کے پاؤں پر سہر رکھ دینا بھی پڑتا ہے یہاں
کو فراہم کرنا اس کے لئے مختلف ٹیکنیکس استعمال کرتا ہوں۔ جن کا
انکشاف میرے بس سے باہر ہے۔

میں جب مالک کے ساتھ ترنم سے شعر پڑھتا ہوں تو میرے
بلی کھانے ہوئے بالوں پر غزل کے مسودہ کے ساتھ تھوڑا سا
ہوتا ہے۔ (Stacy Fee) آج تک نہیں گیا۔
نظریہ رجحان والی ایک فرنگی بائی کے ہاں ایک شعر پہنچ کر اس کی
ساڑیاں دس گنا ہوں۔ تب کہیں کہیں نہایت لمبے کھانے پر راضی ہوتی
ہے۔ اس کے علاوہ میرا کلام اور میرے دو ساتھیوں کا کلام بھی دیکھ لیتی
ہے۔ اس سے پہلے ہم تینوں ایک خوب صورت اور خوب سیرت
پڑھتے تھے۔ اردو کے پکار کو اپنا کلام دکھاتے تھے، ان سے عشقہ سننے
بھی کرتے تھے۔ میری پیشہ ورانہ رسوائیوں سے تنگ آکر وہ صاحب
ہم سے تنگ ہو گئے ہیں۔ فرنگی بائی کی انتہائی توجہ کے باوجود ہمارے
کلام کی غلطیاں سامنے سے سناتی جا رہی ہیں۔ اور ہم لوگ فالوہ
کے وزن پر آرام وہ کا تلفظ ادا کر دیتے ہیں۔ لیکن اس فرق کو ہمارے
مجازی مالکین نہیں سمجھ سکتے، یہی بس ہے۔

ہمارے کئی ٹھوسے ٹھپ چٹکے ہیں، جن میں خوش نویسوں اور
کاتبوں کی اصلاحیں تنگ بھی شامل ہیں۔ ویسے بھی ہم ان کے احسان مند
ہیں کیونکہ اصلاح کے علاوہ کم ریٹ پر کتابت، ڈسکاؤنٹ، اور صفی
کے عہدقات ہم ان سے وصول کرتے رہتے ہیں۔

ہمارے مجازی مالکین اس قدر بھی شریف نہیں ہیں کہ ہم کو
بے مقصد اس قدر ادا کریں۔ دراصل ہم ان کے گھر کے بھیدی ہیں۔ ہم
ان کے سارے سپاہ کارناموں سے واقف ہیں۔ ان کا ماضی اور حال، ظاہر
و باطن، اصلیت اور ڈھونگ، دولت و غربت، غرض ہر کارنامہ ہمارے
ساتھ "انٹرنل سٹیشن" ہے۔ ہم سب درستہ بھی ہیں اور ہم کو ڈرا
بھی ہیں۔ یہ زندگی ایک لمبی دوڑ کا نام ہے۔ ممکن ہے کہ اپنے راز پوشیدہ
رکھنے کے لئے کبھی ہماری بھاری اعزّت سے بھی کھیل جائیں یا ہم
اپنی ممانعت میں سایہ ہیں رہ جائیں۔ مالک حقیقی ہی جانے کہ کس کا دار
پہلے چلے گا، کیونکہ دونوں تلوار کی دھار پر ہیں۔

ایک بات وضاحت طلب ہے کہ ہم اپنے مجازی مالکین کے
اشارے پر لوگوں کو گالیاں دیتے ہیں؟ بات یہ ہے کہ جس کے پاس جو کچھ
ہوتا ہے لوگوں کو دہی کھد دیتا ہے۔ ہم کو فنگی بھر جو بھی ملا (مہرام کی کتابت)
ہم دہی تقسیم کر دیتے ہیں۔

دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں
جو کچھ کچھ دیا ہے وہ لوٹا۔ باہر اس میں

پڑوس

بہشت میں چینی دان، چپا تیاں اور اٹلیٹ میز پر رکھنے کے بعد میری
 بیوی کو کوئلہ لے گئی۔ میں نے دال چکی اور پکارا کہ دال میں نمک بہت
 ہے۔ اس پر میری بیوی نے کہا کہ دال میں میرے اور پڑوس کے گھروں کے درمیان
 کچھ فاصلہ ہے۔ اس پر پڑوس نے کہا کہ ایک گوشے میں
 نمک کی کمی ہے۔ دال میں نمک کی زیادتی کے الفاظ دیوار پار
 کر گئے تھے۔ کڑی تھی اور اس میں پڑوس کا سایہ نظر آیا۔ اس کے بعد
 میں نے کہا کہ دال میں نمک کی کمی ہے۔

میں نے کہا کہ دال میں نمک کی کمی ہے۔ آخر کار یہ بات
 چلی۔ دال میں نمک کی کمی ہے۔ آخر کار یہ بات
 چلی۔ دال میں نمک کی کمی ہے۔ آخر کار یہ بات

کے پٹ اُدھر بند ہو گئے۔

پڑوسن کی آواز کا مقابلہ شاید پٹے بیک سنگرم ہی کر سکتے تھے۔ ارے گانا بجانا چھوڑیے۔ وہ ملازم کو ڈانٹتے تو ایسا معلوم ہو کہ ساغر کھٹک بہا ہے۔ بلور بج رہے ہیں۔ اس پر غضب میری بیوی کا بیان: "ہائے بھابی کا چہرہ بالکل کامنی کوشل میں ملتا ہے، لیکن آنکھیں زرگی ہیں۔ کامنی کوشل سے زیادہ حسین۔"

مخفی مباد کہ مجھے کامنی کوشل کے چہرے کے خطوط کبھی پسند تھے اور میں نے اپنی بیوی کے رویہ و اس پسند کا اعتراف بھی کیا تھا، میرے دل میں کبھی کوئی برائی نہیں آئی، پڑوسن کے شوہر جب زندہ تھے اس وقت انھوں نے دو ایک مرتبہ اپنی اور میری بیوی کو بے پردہ کر رکھنے کی کوشش بھی کی تھی۔ میری بیوی نے اس آفر کو مسترد کر دیا تھا، کیونکہ اس کو بوجھ سے ڈوب تھا۔ ایک تو میں شاعر، دوسرے پڑوسن کی آواز کا مذاہج اور وہ خود بھی پڑوسن کی خوبصورتی کی مذاہج۔

فکر اُس پر ہی دش کا اور پھر بیاں اپنا

نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ بے چلائی بیوہ تک ہو گئی لیکن مجھ سے اُمتا سامنا

نہ ہوا۔

یہ بات فطرت کے مطابق ہے کہ اگر کسی سے کوئی چیز چھپائی جائے تو اسے دیکھنے کو خواہش اور بڑھاپا ہے۔ چاروی پڑوسن کے نہ شرم نہ اولاد۔ ایک دن، بارہ سال کا لڑکا ورہ لیا تھا، وہی گھر کے کام کاج

کر دیتا تھا۔ وہ ایک مکانات اور درایاب ملکوں کے راستے سے رستہ
کی گاڑی چل رہی تھی۔ کبھی لائٹ گھنٹے کی نوبت آتی یا پراپرٹی ٹیکس وصول
کرنے والے بل کلکٹر آتا تو پڑوسن، میری بیوی کے تو سامنے سے بچھ سکتے تھے
طلب کرتی۔ اس وقت میں کھڑی کے قریب ضرور پہنچ جاتا تھا اتنا تو سن سکو
ساغر کیے کھٹکتے ہیں؟ بلور فرشس پر گر کر چین سے کیسے ٹوٹتا ہے۔ بہر حال
کانوں سے دیکھنے کی کوشش کرتا۔ کیوں؟ کیا کانوں سے نہیں دیکھا جاسکتا؟
دیوار کے پیچھے دو مہری جانب اگر آپ کا کوئی شناسا بات کرے تو کان،
آواز سن کر ہی پہچان لیتے ہیں کہ کون ہے اور فوراً اس کا چہرہ آپ کی آنکھوں
کے سامنے آ جاتا ہے۔ ایسے کان "بنیا کان" کہلاتے ہیں جن کانوں میں
سلاہیت نہیں رہتی وہ "اندھے کان" کہلاتے ہیں۔ اسی طرح بعض آنکھیں
بھی کہاں سے آتی ہیں۔ سامنے بیٹھنے والوں کی آنکھیں وہ کہاں سے آتی
ہیں تو ایسی آنکھیں "سننے والی آنکھیں" کہلاتی ہیں۔ انہی آنکھیں سننے کی
سلاہیت نہیں رکھتی انہیں "بہری آنکھیں" کہا جاتا ہے۔ رعیت بھٹی کے
ساتھ اسی مخیمہ کا ایک شعر میرے پہلے مجموعہ کلام "آواز گھنگ" میں موجود

ہے۔

جب سے تعبیر خواب الٹی ہے

کان نہ سمجھتا ہے آواز کبھی

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ پڑوسن کی آواز کبھی نہ ہی جاتی ہے۔ تو کبھی دھنگ
پھر آنکھوں میں لہراتی ہے۔ میری پوری عام ماحولت میں سمجھتی ہے لیکن

اپنا اتو سیدھا کرنے میں ماہر ہے۔ جب بھی اس کو فلم دیکھنے کی خواہش ہوتی ہے۔ اس روز وہ میز پر معمولی ڈشیں کے علاوہ داشت کباب، سیوری اکیس براؤن اسٹو یا رشین پڈنگ کا اضافہ کر دیتی ہے۔ اس طرح کا طعم انہیں دیکھ کر فوراً میرا ہاتھ اپنی جیب کی طرف چلا جاتا ہے، اور میں پاکٹ کو بائیں ہاتھ سے مضبوط پکڑ کر دائیں ہاتھ سے کھانا شروع کر دیتا ہوں۔ ادھر بیوی شروع ہوتی ہے۔ ”اجی، بے چاری پٹو سن تے چھ ماہ سے کوئی پکچر نہیں دیکھی ہے۔ آج مجھ سے کہہ رہی تھی کہ دکن کا سینما دیکھا جائے بشرطیکہ آپ اجازت دیں۔“ میرے گھر کا یہ اصول ہے کہ لڑکوں کو بڑوں کی شادی ہو جانے تک انہیں فلم دیکھنے کی اجازت نہیں دی جاتی ہے۔ اس لئے میری بیوی فلم دیکھنے کو چھپ چھپا کر جاتی ہے۔ اس معاملے میں وہ بہت ہوشیار ہے۔ اپنی خواہش کو ہمیشہ کسی کتے کندھے پر لگا دیتی ہے اور معصوم و بے بس بن کر سامنے آتی ہے۔ کبھی کسی پرنسسر کی بیوی کی خواہش میں لپٹی ہوئی کبھی نند کی آرزو بن کر، انہیں چاہے جس کے سبب میں پکچر کی آرزو انگریزیاں لیتی رہتی ہے۔ آخر کو یہاں تک بھی پہنچا ہے کہ میں رات کا کھانا کھا کر آرام لے رہا ہوں۔ وہ آئی، ”اجی، یہ ہماری بات کیسی بے وقوف ہے۔“ ”نہ پوچھا، کیا بات ہے؟“ ”کہنے لگیں آج کل اس نے کوئی پکچر نہیں دیکھا، سوچتی ہوں کہ ایک پرانی پکچر ”مغل اعظم“ گھر کے قریب لگی ہے، غریب کو دکھا لاؤں۔“ میں نے کہا، ضرور ضرور، وہ اس کی عاقبت خراب ہو سکتی ہے۔“ وہ ہنس پڑی اور باورچن کو اپنی پرانی

سارمھی اڑھا کر اُور کشا میں ساتھ لے کر چل دی۔ پردہ فیر کر بیوی سے کہے
 باور چن تک پکچر دیکھنے کی تمنا کیسے کیسے روپ بھرتی ہے۔
 ایک روز پڑوسن کے ساتھ پکچر کو یہ نکلیں اُسے علامہ مہر الدین خوشنما
 بہ یک بیٹنی وریش سفید آدھکے۔ ڈاکٹر آج کا اخبار دیکھا؟ میں نے کہا
 ”دیکھا“ وہ بولے ”خاک دیکھا“ ارے سکن آباد میں وہ پکچر لگی ہے کہ
 کسی ایکٹریس کے جسم پر بالشت بھر کر نظر آجائے تو ایک سو روپے
 جرمانہ دینے کو تیار ہوں انگریزی فلموں کی بات باری ہندی فلموں میں کہا
 آسکتی ہے؟ میں نے کہا ”علامہ آج میں نے نفل روزہ رکھا ہے“ علامہ بولے
 مکمل چلیں گے۔ دیکھو ڈاکٹر، میں اس بات کا قائل ہوں کہ پھوٹے موٹے
 نگاہ باری کے گناہ کر لو، اور بڑے بڑے علمی گناہوں سے بچ جاؤ۔ میں نے کہا
 مجھے آپ کے اسی غصے سے صدنی صد اتفاق ہے۔ اسی لئے تو آج نفل
 روزہ رکھا ہے۔ مولانا بولے۔ ”یہ کیا بات ہوئی؟“ میں نے کہا۔ ارے،
 آج پڑوسن میرا روزہ کھنا رہی ہے۔ ڈاکٹر والی کھڑکی کھل گئی ساغر کھلنے
 کی آواز بار بار آئے گی۔ یہ لو سالوں، یہ لو روٹی، یہ چاول یہ میٹھا۔ علامہ
 تھوڑکے تھوڑکے بولے۔ ”میں نے بھی بہت کوشش کی لیکن آپ کی پڑوسن
 کی زیارت نصیب ہی نہیں ہوئی، بڑا گناہ اڑھا پردا کرتی ہے۔ پھر بھی ڈاکٹر
 میں کہتا ہوں جب آپ کی بیوی کہتی ہیں کہ چہرہ بالکل کامنی کوشل کا سا ہے
 تو پھر زیارہ ترد کی بات کیا ہے۔ کامنی کوشل کے منہ سے ساغر کی
 کھٹک والی آواز، خیال ہی خیال میں سن لو، پڑوسن حاضر ہے۔“ میں

نے کہا۔ علامہ، میں پھر سے اور آواز کو نہیں ملا پا رہا ہوں، جیسے برقی گڑیا کو
 تیل میں ڈالنے سے عمل اخذاب کہاں ہوتا ہے؟ علامہ بولے۔ تو پھر ایک
 ترکیب کرو۔ میرے گھر میں دعوت دی جائے، وہاں میں ایسا انتظام کر سکوں
 گا کہ چہرے کی زیارت ہو ہی جائے گی۔ میں نے کہا۔ اب اس کی ضرورت
 نہیں۔ اس انوار میری بیوی اور پڑوسن بیٹی شہود دیکھنے کو جا ہی رہی ہیں میں
 وہیں جا کر درشن کر لوں گا۔ مخفی مباد کہ مولانا جب بھی میرے گھر تشریف لائے
 ہیں میری بیوی بڑ بڑا لے لگتی ہے۔ علامہ آئے ہیں، اب لے جائیں گے آپ
 کو نگوڑی انگریزوں کی نگلی غلیں دکھانے کو۔ انوار کو دو بچے دونوں بچہ
 کے لئے نکلیں۔ ادھر میں بھی آٹو میں ان کے پیچھے روانہ ہو گیا۔ دونوں بچہ
 ہاؤس میں داخل ہوئے اور میں قریب کی ایک دوکان میں گھس گیا۔ میں نے
 ان پر نظر رکھی تھی۔ جوں ہی وہ ٹمکٹ لے کر اوپر چلین میں بھی اسی ونڈو سے
 ٹمکٹ لے کر ساتھ بڑھا۔ چونکہ سیٹیں بہت خالی تھیں اور مشینیں نے سیٹ
 کے انتخاب میں آزدی دے رکھی تھی، اس لئے منہ پر دستی رکھ کر کھانسا
 ہوا ہال میں داخل ہوا اور لباس سے اپنی بیوی کو پہچان لیا۔ ان سے تین
 قطاریں چھوڑ کر پیچھے کی جانب اپنے لئے سیٹ پکڑ لی۔ وہاں بیگ رکھ
 دیا اور باہر واپس آ گیا۔ جب اندھیرا چھایا تب اپنی سیٹ پر پہنچ گیا۔
 حالات کی ستم ظریفی دیکھے کہ دونوں وہاں سے ساتھ کر ٹیکے پر سوار
 والی سیٹوں پر آ گئی تھیں۔ دونوں کی ہنسی، کنکشن سب کے سب رہا تھا۔
 ساغر کھنک رہے تھے، اور بلور فرشتے پر گر کر چپس لے رہے تھے۔

تھہرے ہر پہرے، آخر کو انٹرول ہوا اور میں فوراً منہ پر دستی ڈال کر کھانسی
 ہوا باہر آگیا۔ ہر دروازے سے جھانکنے کی کوشش کی لیکن پٹوسن نے
 ساری کاپیوں پر اس طرح اور ڈھکیا تھا کہ پہرہ نظری نہ آسکتا تھا۔ انٹرول
 ختم پھر پھر شروع ہوئی۔ وہی کنکشن وہی رہی، مگر فوارے۔ مجھ اپنا ایک
 شعر یاد آیا۔

چاندنی تھی کہ غشی سب پہ برس جاتی تھی

اس کی نظروں میں کوئی اپنا پرایا بھی نہ تھا

جیسے ہی کھیل ختم ہوا میں تیزی سے آگے بڑھ گیا اور غم کر لیا کہ
 خواہ کچھ ہو جائے اب تو آنا سامنا ہو گا ہی۔ میں EXIT سے باہر آیا۔
 سیڑھیاں اتر کر باقاعدہ اس طرح کھڑا ہو گیا کہ کسی صورت نشانہ خطا نہ ہونے
 پائے۔ چپا پھر میری بیوی آگے آگے امداد اس کا ہاتھ پکڑے ہوئے پٹوسن
 آتی۔ امداد میری نظر ان پر پڑی اور ان کی نظر مجھ پر پڑی۔ ایک لمحے کے
 ساتھ وہ میری بیوی کی پشت میں چھپ گئی۔ لیکن اس وقت تک میں سب
 کچھ دیکھ چکا تھا۔ چھوٹے چھوٹے ریرے گجگے جیسے، چٹنی ناک، پچکلے
 نکالی، امر مردوں کا فیلا۔ رنگ سرخ و سفید لیکن بال؟ ہزاروں سفید بالوں
 میں ایک آدھ کا لا بال۔

خدا کی پناہ۔ بارہ برس پٹوسن میں رکھ کر میری بیوی مجھ کا منی کوشش
 کا دھوکہ دیتی رہی۔ کسی نہ کسی طرح گھر پہنچا۔ میری بیوی پٹوسن کو اس کے

گھر چھوڑ کر جب اپنے گھر میں داخل ہوئی تو مجھے دیکھ کر ہنسی کے مارے
 لڑنے جا رہی تھی۔

بارہ سال تک میں نے ماہی کو شیل کا چہرہ اور سانپ کی کھٹک کو
 ایک ساتھ رکھا تھا لیکن یہ خواب ٹوٹ گیا اور اب یہ حال ہے کہ:
 جب سے تعبیر خواب الٹی ہے
 کان اندھے ہیں آنکھ بھری ہے

کلب کی ایک رات

زندگی کی بنیادی ضروریات میں اب کلب بھی داخل ہو گیا ہے میرے ایک پڑوسی دوست نے ہزار پہلوؤں سے مجھے قائل کر کے کلب کا ممبر بنا دیا تھا۔ یہ بات بعد کو سمجھ میں آئی کہ روزانہ کلب آنے جانے کے لئے دراصل ان کو میری ضرورت نہیں بلکہ میری کار کی ضرورت تھی۔ زندگی میں پہلی مرتبہ کلب گیا تھا، سارے چہرے نئے تھے۔ پڑوسی صاحب نے میرا تعارف کرایا۔

”آپ سے ملنے، قاضی غیاث الدین، شاعر بھی ہیں۔ اور میرے پڑوسی بھی۔“ پڑوسی کے لفظ پر سارے ہونٹ تبسم سے لبریز ہو گئے۔ ایک جلد باز بے تکلف دوست شہبہود اس نے آخر کہہ ہی دیا۔

”تو پھر آپ کو کلب آنے جانے میں سہولت تو مل گئی۔“ اس مختصر

تعارف کے بعد ب لگ مختلف پارٹیوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک برج کی پارٹی، ایک رنی کی پارٹی، ایک پارٹی جس کھیلنے کو بیٹھ گیا۔ پہلے ہی دن مجھے اکیلا دیکھ کر دو خواتین ازرا و ہمدردی میرے قریب آکر صوفے پر بیٹھ گئیں۔ ایک محترمہ جو کم سے کم کپڑوں میں ملبوس تھیں، گرمی کی شکایت کرنے لگیں۔ وہ اپنے مختصر کپڑوں کا جواز ڈھونڈ رہی تھیں۔ دوسری محترمہ کہہ باغداد میں ایک انگریزی ناول اور بڑی سی پرس کو دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ ان کا ادبی ذوق یقیناً اونچا ہو گا۔

کم لباس محترمہ نے مجھ سے کہا: ”مجھ سے گرمی برداشت نہیں ہوتی۔“
 حالات کہ اکثر لوگ یہاں گرم کپڑے پہن کر آئے ہیں۔
 دوسری محترمہ جو چالیں کے لگ بھگ ہوں گی، مجھ سے کہا: ”دس سال قبل مجھے بھی گرمی کی برداشت نہیں تھی۔“ پھر میری جانب متوجہ ہو کر پوچھنے لگیں۔

”آپ اپنی مسز کو کلب کیوں نہیں لائے؟“ میں نے کہا وہ کئی ماہ سے مسلسل بیمار ہیں۔ اتنے میں شبہو داس بھی گفتگو میں شامل ہو گئے۔ کہنے لگے۔

”کیا آپ کی مسز سخت علیل ہیں؟“ میں نے مختصر جواب دیا۔
 ”ہاں۔“ وہ پھر پوچھنے لگے۔

”کیا بیماری سے بچ جانے کی امید ہے؟“

میں حیرت سے انھیں دیکھنے لگا۔ وہ شیشائے پھر کہنے لگے۔

اصل میں کہنا کہ اس ماہیت تھا، مگر منہ سے کھسکا نہ لیا گیا۔ آپ ہی دیکھئے! روزانہ کوئی نہ کوئی خوش خبری مجھ کو سننی پڑتی ہے۔ مثال کے طور پر۔ اس دوست کی بیوی کا انتقال ہو گیا۔ فلاں دوست کی بیوی بھاگ گئی۔ پڑوسی کا بیوی اس قدر سخت تحلیل ہے کہ بچنے کی قطعاً امید نہیں۔ ایک عزیز کی بیوی نے زہر کھالیا۔ لیکن ہمارے لئے کوئی خوش خبری نہیں۔

میں نے حیرت سے پوچھا۔

”کیا آپ ان تمام حادثات کو خوش خبری سمجھتے ہیں؟“

کہنے لگے۔ ”پھر آپ کیا سمجھتے ہیں؟ کیا آپ نے گزشتہ بیس برسوں سے ایک جی سوٹ پہن رکھا ہے؟ ایک ہی کار میں بیٹھ آئے ہیں۔؟ آپ کے کمرے کا بلب بجلی جانے کے بعد آپ نے دوسرا بلب روشن نہیں کیا؟ ...“

بڈشیٹ آپ نے بیس سال سے نہیں بدلی؟۔

میں شبہو اس جی کے لیے سروپا باتوں سے لے کر پریشان تھا کہ کیا

جواب دوں؟

کم لباس محترمہ نے کہا۔

”شبہو اس جی! آپ کار، بلب، جوتا، بڈشیٹ، فائونٹین پن سے اپنی ساری زندگی کا دواںہہ لے رہے ہیں۔ اس طرح ہم خواتین بھی اپنے شوہروں کے تعلق سے سوچنا شروع کر دیں تو پھر آپ کہاں رہیں گے؟“

شبہو اس جی مسکرائے۔

”بھائی، میرا کہنا بھی تو یہی ہے کہ سوچو، بالکل ایسا ہی سوچو۔ ایک

ہزار ہا سہ۔ بلا ہنگامہ کہ لباس پر عمل بھی نہ ہو، اور اس طرح ہنگامہ
 گردنوں کو سولی کے پھندوں سے نکالو۔
 دونوں خواتین غماہوں پر چبٹ رہی تھیں اور شہسوداس بیٹھے
 سہ۔ مسلسل ہنستے رہے۔ میں نے مسکرا کر ایک آنکھ دہلائی
 "خوب، شہسوداس جی، آپ نے یہاں سے دونوں کو اٹھا دینے
 کے لئے اچھا حربہ استعمال کیا!"

وہ چونک پڑے، اور سوالیہ انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے بولے۔

"کیا میرے بیان کو آپ بناوٹ سمجھتے ہیں۔"
 قاضی صاحب! میری بیوی جھگڑاں کسی کو ایسی بڑی
 نہ دے، وہ کبھی بیمار نہیں ہوتی، خون کا امتحان کر لیتے ہیں، وہ میرے
 خون میں ستر فی صد اور ایسا کہ خون تیرا فی صد وزن میں آتا ہے پندرہ
 پاؤنڈ زیادہ کیسی ہی سخت مردی پڑے، کتنی تیز اور سو سو بارش
 ہو، اس کو جینک تک نہ آئے گی۔ کسی اکوار واقعے پر اس میں پشیمانہ پر ہی
 نہیں آئے گا۔ جتنی کہ میں جھڑکی دوں تو بھی وہ مسکرائے گی۔ صبح، دوپہر
 شام ہر وقت مسکراہٹ اور اڑی سے ابد تک ہونٹوں پر بسم مجھے آرزو
 رہی کہ وہ کبھی تیز کوازیں مجھ سے، غلامین سے، عزیزوں سے، پڑوسیوں
 سے اور دوستوں سے ابرو میں شکنی ڈال کر بات کرے۔ جھگڑاں غلامت کر
 اس کی مسکراہٹ کو، ہونٹوں سے نیچے اتار دیتی ہیں، جب دیکھو گھر کے کام
 کھج میں معصوف، میرے کپڑے دھو رہے ہیں۔ اس طرح ہر کام میرے

لے کر طرح طرح کی شےیں پہنا رہی تھیں۔ ارفی نے مجلس رہی ہے۔ پستیہ میں شرابور ہے۔ لیکن میرا سامنا ہونے ہی اسپرنگ کی طرح اچک کر مسکراہٹ اس کے لبوں پر آجاتی ہے۔ میں یہ توقع رکھتا ہوں کہ وہ موسم کا، بے حد مصروفیت کا، یا کم از کم میری بے توجہی کا روزنا روئے گی۔ بھگوان کی قسم ایسا مسکراتی ہے کہ بس دل میں ایک دم بھالا اتر جاتا ہے۔

اتنا کہ کر شبھو داس جی نے بھرائی ہوی آواز میں کہا۔

”قاضی صاحب، بھگوان کے لئے اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ سے مجھے نجات دلائیے۔ ورنہ میں جی نہ سکوں گا۔“

اُد میں نے دیکھا کہ واقعی شبھو داس جی کی آنکھیں جھپک گئی ہیں اور وہ مسکیاں لے رہے ہیں۔

میں وہاں سے اٹھ گیا۔ جب دوسرے ہال میں گیا تو دونوں خواتین قریب آگئیں اور مجھ سے کہنے لگیں۔

”شبھو داس جی سے آپ کا مکمل تعارف ہو گیا نا؟“

میں سر اسیڑ تھا کہ بے چارے کو کس خانے میں فٹ کروں۔ میں نے کہا۔ ”یا تو بہت پی گئے ہیں یا پھر ان کے دماغ کے ایک دو اسکرؤ ڈھیلے ہیں۔ وہ کہنے لگیں۔“

”نہیں قاضی صاحب موصوف روزانہ ہم سے بھی یہی درخواست کرتے ہیں کہ ان کی بیوی کی مسکراہٹ، محبت اور شرافت سے نجات دلائیں۔“ کم لباس محترمہ نے کہا۔

”خیر مجھ سے تو انھوں نے صرف ایک ہی مرتبہ کہا ہے مگر وہ سہی

بلکہ کہیں تو مجھے سوچنا پڑے گا۔“

اسے یہ خیر ہے پڑوسی آگے

”بھئی، اب گھر چلتے ہیں۔ جیب میں جتنے پیسے تھے رنجی کی نذر ہو گئے

اور آپ نے کلب کی تفریح بھی کر لی ہوگی۔“

پھر دونوں خواتین سے بھی مخاطب ہوئے۔

”آئیے آپ دونوں بھی ہمارے ہی ساتھ چلیے، رہائشے میں آپ کو

ڈراپ کر دیں گے۔“

مگر اس دونوں مختراؤں کو ان کے گھر اور پڑوسی کو ان کے گھر چھوڑ کر جملہ

ایک لیٹر پٹرول خرچ کر کے میں گھر پہنچا تو میری بیوی میز پر میری منتظر تھی

اور اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ مجھے اتنے تاخیر کیا وجہ چھوڑی تھی میں سوچ

رہا تھا کہ کیا اس مسکراہٹ کو کوئی نرم کر کہ اس سے نجات حاصل کرنے کی

کوشش کر سکتا ہے ؟

لیکن جب کبھی بڑی شہزادی ہے تو مجھے سیٹھ شہجود اس جی

کے آئینہ اور عکسیاں یاد آتی ہیں۔ وہ دن اور آج کا دن پھر کبھی کلب

نہیں گیا۔

مس کلاوتی انصاری

کہنوی سفید بے شکن پر شکوہ لباس پہن کر گھر سے نکلتی ہے تو لوگ سمجھتے ہیں کہ کوئی ریزہ پیوٹین شادی کے لئے گرجا گھر جا رہی ہے کبھی بلاکسٹین کا بلاؤز اور orange کمری ساڑھی پہنے، جوڑا ہانڈے، جوڑے میں پھول لٹکائے گھر سے نکلتی ہے تو لگتا ہے ٹینک بند پر کسی پری سے ملنے کو جا رہی ہے۔ ایسا تبی ہوتا ہے کہ کہنیوں تک سفید کھدر کا بلاؤز اور سفید کھدر ہی کی ساڑھی پہنے بلکہ ساڑھی کا پلوں پر ڈالے گھر سے نکلتی ہے تو۔۔۔ سیاسی پارٹی کا سوشلزم کا معلوم ہوتی ہے۔

اسے کوئی مس کلاوتی کہتا ہے۔ کوئی مس انصاری کہہ کر پکارتا ہے۔ کوئی مس کلاوتی انصاری کے نام سے یاد کرتا ہے۔ مذہب اس کا اُسی کو مسلم، کس مسجد، مسجد یا گرجا میں بھی نظر نہیں آتی۔

اردو نہایت شستہ اور انگریزی کا تلفظ اور روانی حیرت انگیز ہندی
 اور تلگو بھی اتنا جانتی ہے کہ لکھ پڑھ لینے کے علاوہ بول لیتی اور سمجھ لیتی ہے۔
 اس کے دوستوں میں بوڑھے جوان، بچے، مرد اور عورتیں سبھی ہیں۔ پڑھے
 لکھے دانشور بھی اور اُجڑے جاہل گنوار بھی۔ عمر ہوگی پچیس تیس کے لگ بھگ
 قدم متوسط و متناسب، بھرا بھرا جسم، سرخ و سفید رنگ ہر وقت سچی
 سجائی، اس کا گھر دو کمروں پر مشتمل ہے۔ ایک انتظار گاہ دوسرا اس کا
 نجی کمرہ۔ انتظار گاہ میں ہر قسم کا مرد اور ہر قسم کی عورت۔ وہ سچی سجائی
 اپنے پرائیویٹ روم سے نکلتی ہے اور ہر فرد سے احوال سنتی جاتی ہے اور
 اپنی مٹھی سی ڈائری میں نوٹ کرتی جاتی ہے۔ دلاسے دیتی ہے۔ یقین دلاتی
 ہے۔ "میں آج ہی منسٹر صاحب سے ملوں گی اور آپ کا کام ہو جائے گا۔
 میں نے ناظم صاحب سے کہہ دیا ہے انھوں نے وعدہ کر لیا ہے، ملازمت
 آپ کو مل جائے گی۔"

اس کا گھر میرے گھر کے دو برو تھا۔ میں علی الصبح اخبار لے کر اپنے
 ڈرائیونگ روم میں آ بیٹھتا لیکن جب اندر سے ناشتے کا بلاوا آتا تو اخبار
 لے کر اندر جانا۔ ناشتے کے بعد اخبار میری بیوی کی ملکیت بن جاتا ہے
 وہ پڑھنا شروع کر دیتی ہے اور ایران، افغانستان کی سیاست سے
 لے کر کامن ویلتھ تک پہنچ جاتی ہے اور تازہ خبروں پر مجھ سے بحث
 کرنا چاہتی ہے۔ جب میں جواب دے نہیں دے پاتا ہوں تو وہ کہنا شروع
 کر دیتی... صبح آپ نے اخبار پڑھا کب ہے؟ سانس دالی اسی میں چند

کو گھورتے بیٹھتے ہوں گے۔

میری بیوی اس بے چاری کو "مس چندہ" اس لئے کہتی تھی کہ وہ سال میں تین چار مرتبہ غریبوں کی مدد کے لئے چندہ مانگنے آیا کرتی تھی۔ میری بیوی تو دس روپے سے کبھی آگے نہ بڑھی لیکن میں آنکھ بچا کر اسے دیوان خانے میں پچیس پچاس تھا دیتا اور رسید نہ لیتا تھا۔ میں اس کے سوشیل ورک کی تعریف کرتا اور میری بیوی میری مخالفت کرتی تھی۔ بیوی کا خیال تھا کہ وہ چندوں کی ساری رقم اپنے لباس اور بناؤ سنگھار پر خرچ کر لیتی ہے۔

میری بیوی کو بڑی فکر تھی کہ وہ کیسے پکاتی ہوگی؟ کیا پکاتی ہوگی؟ اس کا خاندان کیا ہے؟ اس کا مذہب کیا ہے؟ کہاں سے آئی ہے؟ کہاں جا لے والی ہے؟ میں کہتا۔ "دس برسوں سے تو سامنے ہے، کبھی اس کی کوئی جبری حرکت کسی نے دیکھی ہے؟" اس پر میری بیوی چراغ پا ہو جاتی۔ "جی ہاں! ایسی ہی محترماں چھپ چھپ کر سب کچھ کرتی ہیں۔ آخر اس نے شادی کیوں نہیں کی؟" میں کہتا۔ "میں کسی روز اس سے پوچھ کر بتاؤں گا؟" میری بیوی ہنسنے لگتی۔ "خدا کی قسم جو آپ اس کے گھر گئے۔ پھر میرے گھر نہ آنا۔ میں نہیں دیتا،"

مس سٹارڈی انصاری سے اگر کوئی پوچھتا۔ "آپ کا مذہب کیا ہے؟" تو وہ بڑے فخر سے جواب دیتی۔ "انسانیت"۔ وطن؟ تو وہ کہتی۔ "دھرتی"۔ گھر کا پتہ؟ "میرا وطن ہے۔ خاندان؟ تو کہتی۔ "اُدھی کی اولاد ہوں۔" رشتے دار

عزیز و اقارب و قوم و بھائی " دنیا کا ہر مظلوم، محسوس و مریب اور کمزور میز ارشتہ دار، عزیز اور دوست ہے۔ ان کی خدمت کر کے میں خدا کو بھگوان کو پہنچاتی ہوں۔ "

ایک دن میں ایک لائبریری میں کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ وہ میرے قریب اگر بیٹھ گئی۔ سلام و دعا کے بعد اس نے جیب سے ایک کاغذ نکالا اس پر ایک مصرعہ لکھا تھا اور تاریخ درج تھی۔ میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ بول اٹھی۔ " مجھے اس طرح میں سات شعر کی ایک غزل چاہیے۔ اس تاریخ سے پہلے بلکہ آج ہی کے دن اسی جگہ " میں نے وعدہ کر لیا۔ ایک ہفتہ گزر گیا۔ میں لائبریری کچھ تاخیر سے پہنچا۔ وہ موجود تھی کہنے لگی۔ " میں تخلص لکھنا بھول گئی تھی۔ تخلص حنا ہے۔ "

میں نے مقطع اسی وقت کہا اور کاغذ ابے دے دیا۔ وہ معلوم کرنے لگی۔ " میں اس کے معاوضے میں آپ کی خدمت بھیج کر دے دوں گی۔ " میں نے کہا۔ قطعاً نہیں۔ ایسا آپ بھی نہیں کریں گی۔ " وہ مسکرائی۔ " ہوتا ہوگا اور چینی کے چھول برس گئے۔ وہ چلی گئی۔ اب میں لائبریری کو جانا آئے لگا تھا۔ وہ برابر ملتی، کبھی غزل، کبھی نظم اور کبھی مضمون کی فرمائش کرتی۔ حیرت تو مجھے اس بات پر تھی کہ وہ مقطعوں میں ہمیشہ نئے نئے تخلص لکھواتی۔

ایک روز ہم معمول کے مطابق بیٹھے تھے۔ لائبریری میں ایک وہ اصحاب کے سوا کوئی نہ تھا۔ میں نے دل کر ڈاکر کہ اس سے پوچھ ہی لیا کہ

یہ مضمون نگار نواتین اور شاعرات کون ہیں تو وہ بہت آزدہ ہو گئی...
 کہنے لگی، کچھ جھوک پیاس کی ماری عورتیں ہیں، معمولی پڑھی لکھی۔ میری
 ایک دوست ایک ادبی جریدہ نکالتی ہے میں یہ سب کچھ اس کو سونپ
 کر روپے حاصل کرتی ہوں اور آپ کی شاگرد (یعنی میں) کی شاگرد خواتین
 میں یہ روپے تقسیم کر دیتی ہوں۔ وہ آب دیدہ ہو گئی تھی۔ بھرائی ہوئی
 آواز میں کہنے لگی۔

”میں صرف ان خواتین کی خدمت کرتی ہوں جو اپنے شوہروں کے
 ظلم سے تنگ آ گئی ہیں یا پھر بلا امتیاز جنس ان لوگوں کی خدمت کرتی
 ہوں، جن کے ماں باپ نہیں ہوتے یا وہ لوگ جو اپنے ماں باپ کو نہیں
 جانتے۔“ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ”شہر کی ایک مشہور ہوٹل
 کے مالک کی بیوی ہوں۔“ بی، اسے ہوں، سیون پکوان میں ڈپلوما ہے۔
 میرے پاس۔ لیکن میں نہیں جانتی کہ میرے باپ کون ہیں۔ کس نے مجھے
 جنم دیا ہے۔ یتیم خانے کی شفیق ہیڈ مسٹرس نے میری شادی ایک لکھتی
 سے کر دادی۔ جب مجھ سے اس کا جی بھر گیا تو میرے ماں باپ کا نام پوچھنا
 شروع کیا۔ پہلے بے التفاتی، پھر ظلم پر اتر آیا۔ میں نے اس کا گھر چھوڑ
 دیا ہے۔ یتیم خانے کے زندگی گزار لیتی ہوں، بن ماں باپ کے انسانوں کی
 اور مظلوم بیویوں کی خدمت کر کے دل کا بوجھ ہلکا کر لیتی ہوں۔ ہر ظالم ایک
 نہ ایک دن سزا کا مستحق ہو جاتا ہے۔ میں صرف ظالموں کی گردنوں میں سولی
 کا پھندا دیکھنے کو زندہ ہوں۔ میری یہی ایک آرزو ہے، وہ میری زندگی

میں رکھا کیا ہے ؟ گناہ کوئی اور کرے اور جھگڑے کوئی اور، میں مٹا کر بدل نہیں سکتی۔ انتقام کے لئے قانون اپنے ہاتھ میں نہیں لے سکتی، صرف اپنے جیسوں کی خدمت کر کے ہی سرور رہ جاتی ہوں، اور پر امید ہوں کہ میں جن کی خدمت کر رہی ہوں، شاید ان میں سے کوئی ایسا جیالا اور بہادر نکلے جو سارے مظالم کا بدلہ چکا دے۔

میں حیرت اور عبرت کا نمونہ بنا اس کی باتیں سن رہا تھا شہر سے زیادہ میٹھا لہجہ رکھنے والی خاتون کے لب کیسے کڑوے کیسے لفظ آ رہے تھے۔ گلاب کی پکھڑی جیسا بدن رکھنے والی خاتون کے دل میں کتنی سیاہ اور جھیا نک حقیقتیں چھپی ہوئی تھیں۔ اس حسن و نزاکت کے پیکر میں کیسے پُر اعتماد اور طاقت مند اعزاز کم پو شیدہ تھے۔

وہ کہنے لگی۔ آپ جس شہر میں ہیں اس وقت تشریف فرما ہیں اس میں مذہب و اخلاق پر لکھی گئی کتا بین میرے اسی ظالم شوہر کی عطا کردہ ہیں۔ اس عطیے کے سلسلے میں تنہیت کے دن بڑا شان دار جلسہ ہوا تھا اور بے شمار پھولوں کے پار ہمارے شہر کی بڑی بڑی شخصیتوں نے اسے پہنائے اور کئی مشہور اخباروں میں اس کی تصویریں طویل تعریفوں کے ساتھ شائع کی گئیں۔ میں ان اشتہاروں پر اور اس تنہیتی تقریب پر بہت ہنسی۔ اتنا ہنسی، اتنا ہنسی کہ جے پوس ہو گئی اور اخبارات کے ایڈیٹرز اور شہر کے بڑے بڑے شخصیات

کچھ دیر کے لئے وہ رک گئی پھر بولی

مجھے بھی اسی وجہ کوئی کہتا ہے، یہ ہندو ہے یہ مسلمان ہے، یہ عیسائی ہے،
 پارسی ہے۔ حالانکہ انسانوں کی صرف دو قسمیں ہوتی ہے۔ ایک ظالم اور
 لوٹنے والا۔ دوسرا مظلوم اور لٹنے والا۔ جب تک سارے مظلوم متحد
 نہ ہو جائیں۔ دنیا سے ظلم نہیں اٹھ سکتا اور جب یہ ظالم جانتے دنیا سے
 ختم ہو جائیں تو انسانوں کی صرف ایک ہی قسم رہ جائے گی۔ محض شریف اور
 طاقتور انسان۔

میرا صحیح نام آپ کو نہیں معلوم، میں نے خود اپنا نام کلاوٹی انصاری
 رکھ لیا ہے۔ کیونکہ مجھے کلا بہت پسند ہے اور انصاری اس لئے کہ جب قحط
 کی زمین تنگ ہو جاتی ہے تو مظلوم ہجرت کر کے مکمل ٹکاؤں میرے پاس آتے ہیں
 تو میں ان مہاجرین کے لئے انصار بن جاتی ہوں۔ اپنی عصمت و عزت
 کو چھوڑ کر ان کی خدمت میں ہر چیز پیش کر کے سکون حاصل کرتی ہوں۔
 یہ تقریر اس کے منہ سے سننے کے بعد مجھے یہ نازک حسینہ فولاد
 کا پیگر لگ رہی تھی۔ واقعی انسان بھی تضادوں کا ایک شہر ہوتا ہے۔

جہاں استاد

چالیس برس کی مشقِ سخن اور ساٹھ سال کے سن نے جہاں استاد کو
 گرگِ جہاں دیدہ بنادیا تھا۔ پہلی بیوی کی عمر بچپی سال تھی اور یار دوستوں
 نے ایک مال دار تاجر کو پہلے جہاں استاد کا شاگرد بنایا بعد کو جہاں استاد
 نے اس تاجر کی بیس سالہ لڑکی لعل بی کو اپنی چوتھی بیوی بن جانے کا شرف
 بخشا۔ جہیز میں نیا ڈبل بڈ، نیا فین، نیا صوفیہ میٹ، غرض ہر چیز نئی ملی
 تو پرانی بیوی نے ہنا کر ناز پڑھی اور کچے بالوں سے دعا مانگی۔
 ”لعل بی میری طرح بچوں کی نانی ہو جائے
 اس کی جو چیز نئی ہے وہ پرانی ہو جائے“

جہاں استاد بیویاں تلاش کرنے میں ہارے یا ہریں۔ عمر خاندان
 پیشہ تعلیم کسی بات کی قید نہیں۔ شرط صرف اتنی ہے کہ یہی مفید ہو۔

ہاں یہ وہی وہی ہے جس سال کی وہ اپنی ساری صاحبہ کے
سے جھکائی ہوئی لڑکی ہے۔ جب کسی سے مقدمے کی نوبت آجائے تو
جہاں استاد کے خسر صاحب گون شانوں پر ڈالے، گلے میں پٹہ لٹکائے
جہاں استاد کی وکالت کو موجود ہوتے ہیں۔

دوسری بیوی پولیس آفیسر کی بیٹی ہے۔ سارے شہر پر جہاں استاد
کی کوتوالی چلتی ہے۔ کسی شاگرد نے "معمول" نہ پہنچایا تو پولیس والا اس کو
پکڑ کر جہاں استاد کی خدمت میں پیش کر دیتا ہے۔ یا چھوٹی حریف یا عجم
شاعر کی درگت بنانی ہو تو جہاں استاد کے خسر صاحب کو کوتوالی کا ڈنڈا
اٹھا لیتے ہیں۔ شہر کے سارے غنڈے جہاں استاد کو جھک جھک کر
سلام کرتے ہیں۔ اور جہاں استاد گینڈے کی طرح حرف گردن ہلا کر
ان کے سلام کا جواب دیتے ہیں۔

جہاں استاد کی تیسری بیوی ہسپتال میں نرس ہے۔ پلنگ کی
سفید چادریں، پچھرواں، تکیوں کے غلاف، دودھ، برڈ ٹانک کی بوتلیں،
وٹاس کی گولیوں اور تازہ میوے، دن میں دو مرتبہ دو اخانے سے آجاتے ہیں
پہلی تاریخ کو چار سو روپے کے کرکر اچھے نوٹ جب نرس بیوی جہاں
استاد کے ہاتھ پر رکھ کر مسکرا دیتی ہے تو جہاں استاد سر مغرب ہی چراغ
نکل کر کے اندھیرے میں اس کی پڑ غلوں مسکراہٹ کو اپنے ہونٹوں پر
تولتے ہیں۔

مکمل ہو گیا، اس کے بعد اس کے ہاں ایک اور کتا آ گیا

سب پیچھے پڑ گئے ہیں تبسم کے سامنے
جہاں استاد کی چوتھی بیوی ایک تاجر کی اکلوتی بیٹی ہے، اس نے
مال و زر سے جہاں استاد کا گھر بھر دیا ہے۔

جہاں استاد نے شہر کے نامور ڈاکٹروں سے مشورہ بھی کر لیا ہے کہ
ان کے محترم خسر ابھی کئی سال زندہ رہ سکتے ہیں، کیونکہ خسر کے بعد ساری
جائیداد کی وارث ان کی چوتھی بیوی ہی تو ہوگی۔ جہاں استاد کے چاروں
خسر شاعر ہیں اور جہاں استاد چاروں کے لئے شعر کہتے ہیں۔

ان کے علاوہ شہر کے امیر زادے نودو لیتے بھی، جہاں استاد سے
شعر خریدتے ہیں۔ فی غزل، فی شعر، فی ترکیب، فی صنعت مقرر کردہ
قیمت ادا کرتے ہیں، اور شعر لے جاتے ہیں۔ چونکہ معقول قیمت ادا کرتے
ہیں اس لئے کسوٹی لگا کر، کاٹ کر، چھیل کر، پیسہ کن، چیک کر، سونگھ کر شد
خریدتے ہیں۔ خریداروں میں خواتین بھی شامل ہیں۔ جوان سے لے کر بوڑھی
تک، ان پر وہ سے لے کر گرجوٹ تک۔ سب کی سب جہاں استاد کو
حسب استطاعت نہ صرف روپے پیسے دیتی ہیں بلکہ اناج، کپڑا، زلیور
تک، سب کچھ بند کر دیتی ہیں، اور یہ جہاں استاد کی وفادار ایجنٹ بھی
ہوتی ہیں۔ آل انڈیا مشاعرہ ہو تو جہاں استاد ان کے ذریعے ہمارے
مشاعرہ تک اپنے لئے سفارشی پہنچاتے ہیں اور بڑے ٹھانڈے سے مشاعرے
لوٹتے ہیں۔ جس شب مشاعرہ ہوا اسی دن علی برج جہاں استاد کا دربار

ہوتا ہے۔ اور سب شاگردوں کو مختلف رنگوں کی پٹھیلوں پر مختلف روشنائیوں سے لکھی ہوئی فرمائشیں دی جاتی ہیں جن میں جہاں استاد سے دوبارہ کلام سنانے پر اصرار کیا جاتا ہے اور یہ چٹھیاں وقفے وقفے سے متمدن شاعر تک پہنچائی جاتی ہے۔ یہ چٹھیاں ہر درجے سے ہر سمت سے چھوٹے چھوٹے لڑکوں اور لڑکیوں کے ذریعے پہنچائی جاتی ہیں۔ صدر مشاعرہ یا متمدن مشاعرہ مجبور ہو جاتے ہیں اور جہاں استاد کے نام کا اعلان کر دیتے ہیں اور تالیفوں سے میدان گونج اٹھتا ہے، اور جہاں استاد نے پہلا مصرع پڑھا تو شاگردوں نے اٹھایا۔ دوسرا مصرع تو پھر گمراہی کے ساتھ کہہ کر دیتے ہیں۔ تیسرا مصرع تو پھر تعریف سے چھت چھٹ جاتی ہے۔

جہاں استاد کے شاگرد اضلاع میں بھی موجود ہیں۔ ہر مشاعرے میں جہاں استاد کو بلانا ان کا ایمان ہوتا ہے۔ معاوضے بڑھانا۔ جہاں استاد کی قدر و منزلت میں اضافہ کرنا ان کا دھرم ہوتا ہے۔ جہاں استاد کے شاگردوں میں قصاب، حجام، دھوبی اور موچی بھی شامل ہیں۔ ظاہر ہے کہ جہاں استاد کے گھر کے سارے کام کاج آخر کون کرے؟

جہاں استاد کے اضلاع کے شاگردوں کا کام ہے کہ بڑے عہدیداروں ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ارباب مقتدر کو جہاں استاد کی شاعری کی تعریف میں ہر ہفتہ خطوط لکھا کریں، اور مقامی اخباروں کے علاوہ شہر کے بڑے اخباروں کے ایڈیٹروں کو تو صافی خطوط لکھا کریں۔ ملک کے مشہور اور نامور روزناموں کے ایڈیٹروں کے نام خطوط کے کالم میں جہاں استاد کے کسی

شعر کو موضوعِ بحث بنائیں اور قلم کا زور تائید و توصیف میں زیادہ، امداد تنقید میں کم دکھائیں۔ ان مہمات کے علاوہ ایک اہم کام جہاں استاد کے شاگرد انجام دیتے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ شہر کے خنجر بکف نقادوں کو ہر مہمت و عظمتِ طعناں دیتے ہیں۔ کہیں یہ خنجر میر و غالب سے ہوتا ہوا جہاں استاد کی شاعری کے سینے میں پیوست نہ ہو جائے۔

یہ بات قابلِ تعریف ہے کہ جہاں استاد کے جملہ شاگرد ایک دوسرے سے واقف ہیں۔ راستے میں جب ملاقات ہو جائے تو مکڑوں کی طرح گٹھے ملے بغیر یا معانقہ کیے بغیر آگے نہیں بڑھتے۔ آپس میں اتحاد ہے اور سب کا مقصد زندگی ہندوستان کی آبادی میں شاعروں کی تعداد بڑھانا ہے۔ ان کا نظریہ حیات یہ ہے کہ اگر ہندوستان کا بچہ بچہ شاعر ہو جائے تو اسے دن کے فسادات ختم ہو جائیں گے، فکر زیادہ کریں گے، کھانا کم کھائیں گے اور تخیلات کی جنت میں مست رہیں گے۔ سیاسی جماعتوں کی ہڑ لونگ اجتماعی مظاہرے اور ہڑتالیں ختم ہو جائیں گی۔ پارلیمنٹ کے ممبر ایک دوسرے کو غزلیں سنا سنا کر خوب داد حاصل کریں گے۔ اور ہندوستان حقیقت میں جنتِ نشان بن جائے گا۔

جہاں استاد کے شاگردوں میں بعض ایسے بھی ہیں جو زمین کا بیوند آسمان کو اور آسمان کا پیوند زمین کو لگا دیتے ہیں۔ یہ لوگ دولت مندوں کی لڑکیوں کو محلے کے غریب لڑکوں کے ساتھ بھگادیتے ہیں اور غریب

لڑکیوں کو دولت مندوں کے گھروں کی زینت بنا دیتے ہیں۔ شادی
 مشاعرے میں بدل جاتی ہے اور ایسا ایسے سہرے پڑھ جاتے ہیں کہ
 نمائند و ذوق اپنے اپنے دیوانوں میں منہ چھپائے پڑے رہتے ہیں۔

ناگوار و ناگزیر

بچے کو تیز بخار ہے۔ کڑوی گولی ڈاکٹر نے تجویز کی ہے، بچے نے گولی کا اس سے انکار کر دیا ہے۔ ماں باپ، بچے کے دونوں ہاتھ پاؤں قابو میں کر کے منہ کھول کر حلق میں ڈال دیتے ہیں اور دو گھونٹ پانی بھی۔ اس کھلا کر ماں باپ اپنا ناگوار و ناگزیر فرض ادا کرتے ہیں۔

بالکل اسی طرح زندگی کے مختلف شعبوں میں (ایک حق پسند اور فرض انسان کو بھی مختلف حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور اس کے حل کے طور پر ایک ناگوار و ناگزیر فرض ادا کرنا پڑتا ہے۔

ایسا ہی ایک واقعہ میرے ساتھ پیش آیا۔ ایک اخبار کے جو اینٹ ایڈیٹر نے اپنے ملازم کے ذریعہ مجھ سے خواہش کی کہ میں دس سو روپے کا ایک ہفت روزہ لکھوں اور اس کے دفتر میں رہوں۔ میں نے اسے کہا کہ میں خوشنویس

کا ایک قطعہ لکھا دیا۔ "اس کی اہمیت اور قیمت سے بارے میں آپ بی رہا ہے
 کی ضرورت ہے۔" میں نے اپنی رائے تحریر کر دی، اس کے بعد موصوف نے
 فرمایا: فلاں میموریل مشاعرے میں ابتدا سے شرکت کرتے آرہے ہیں، اس
 مرتبہ آپ کا نام ہم نے اس مشاعرے کی فہرست سے نکال دیا ہے۔ اور فلاں
 ٹرسٹ کے مشاعرے میں آپ کو مدعو کیا ہے۔" میں نے کہا "مناسب ہے۔"۔۔۔
 حالاں کہ دوسرے چند شعرا برسہا برس سے اس مشاعرے میں مسلسل پڑھتے رہے
 ہیں، ان کی عدم شرکت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، کیونکہ وہ شعرا ان کے دفتر
 کے چکر لگاتے رہتے ہیں، اور وہ ان کے درباری ہیں۔ بہر حال بات اسی گئی
 ہو گئی۔ فلاں میموریل مشاعرے میں مجھے پڑھنا تو تھا ہی نہیں لیکن توقع تھی کہ
 بعد سماعت مجھے مدعو کیا جائے گا۔ وہ بھی نہیں ہوا۔ فلاں ٹرسٹ کا مشاعرہ
 بھی دھوم سے آیا اور گزر گیا، لہذا کسی مصلحت کی بنا پر مجھے مدعو نہیں کیا گیا۔
 میں نے ان کے وعدے کو نظر انداز کر دیا۔

مشاعرے کے دوسرے دن ہی میرے گھر سے قریب اردو کا ایک فنکشن
 تھا، خیمہ نصب کیا گیا تھا۔ میں پہلی صف میں بیٹھا تھا۔ میری بائیں جانب
 ایک وزیر صاحب آکر بیٹھ گئے ہیں۔ اور دائیں جانب اسی اخبار کے ایڈیٹر صاحب
 براجمان تھے۔ وزیر صاحب نے مجھ سے دریافت فرمایا،

"کل مشاعرے میں آپ کیوں نہیں آئے؟" میں نے وزیر موصوف
 سے دائیں جانب بیٹھے ایڈیٹر صاحب کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ ان سے

ہو چکے۔ اس پرائیڈیٹر صاحب ذرا بھینپ گئے۔ اور لکھ گئے۔ ۲ ڈاکٹر،
 ذرا مشاعرے سے دو ایک روز پیشتر ہمارے دفتر کو آجاتے تو کیا تھا۔
 ہو گئی نا شاعروں، ادیبوں، دانشوروں کی غیرت کی ایسی تیسی !

میں نے اس روز سے ان کے دفتر کو جانا ترک کر دیا ہے۔ کیونکہ وہ
 اردو کے ہر مسئلے پر اپنی بالادستی قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ ایڈیٹر موصوف سے
 کم از کم تیس پر تین سال کی دوستی ہے، دور کی قرابت بھی، سماجی، صحافتی، ادبی
 رشتے بھی۔ ان کے احساناتِ بھہ پر اور میرا اہم تعاون ان کے ساتھ۔ اسی طرح
 ربیع صدی گند گئی۔ میں نے بقدر امکان وظرف و استطاعت، ان کی نام آوری،
 ان کے اخبار کی ترویج و اشاعت میں اپنا فرض بھی ادا کیا ہے۔ لیکن یہاں بات آپری
 فعی عزت نفس کی۔ میں یا بھہ جیسے اور ادیب و شاعر بھی، شاعروں میں شرکت یا
 اخباری شہرت پر، عزت نفسی کو ہرگز قربان نہیں کر سکتے۔ شریف خاندان کے دو
 افراد صرف اس وجہ سے ایک دوسرے سے دور ہو گئے ہیں کہ ایک نہ صرف اپنی
 بلکہ سارے ادیبوں اور شاعروں کی عزت نفس کی حفاظت کر رہا ہے اور دوسرا
 شخص عزت نفس کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے لئے تیغِ انا نیتِ علم کئے ہوئے ہے
 زہر، زن، زمین کا جھگڑا نہیں۔ ایک دوسرے کے دشمن نہیں۔ لیکن خلیجِ حائل
 ہو گئی ہے۔ اس خلیج کی تعمیر میں کتنے انجنیروں نے کام کیا ہے، وہ خدا کو معلوم
 ہے نہ میں نے ان کے دفتر جانا چھوڑ دیا ہے۔ ایسا کرنا کچھ اچھا نہیں لگتا لیکن ایک
 ناگوار و ناگزیر فرضِ جانِ ادا کر رہا ہوں۔

ایک محترمہ میرے مطلب آتی ہیں۔ والد ار حسین اور تعلیم یافتہ میں رہنا
کی نسیں بغداد کرتی ہیں۔ ان کو اختلافِ قلب اور ہائی بلڈ پریشر کے عارضے ہیں
محترمہ ایک مقدس خاندان سے راست تعلق رکھتی ہیں۔ میں مریشوں سے تعلقات
کو وسعت دینے کے لئے ہرگز تیار نہیں لیکن محترمہ کسی نہ کسی بہانے اپنے افرادِ خاندان
بیا بیٹی کو نہ صرف اپنے ہمراہ لاتی ہیں، بلکہ ان کا مکمل اور مفصل تعارف بھی کراتی ہیں
مقصود صاف ہے۔ میرے بچوں سے رشتہ کی آرزو مند ہیں، لیکن ان سے رشتہ
خجے قطعی پسند نہیں کیونکہ محترمہ اور ان کی صاحبزادی کے مختصر ترین لباس میں میرے
دل میں گھر نہیں کر سکتے، ان کے صاحبزادے فلمی ہیرو سے کم نہیں۔ وہ ڈاکٹر ہوں یا
نجفیر مجھے ان کی تقلیدی پوش قطعی پسند نہیں۔ میرا مسلک یہ ہے کہ لوگ ہماری
رکریں۔

ایسے ملا کرو کہ کریں لوگ آرزو

ایسے رہا کرو کہ زمانہ مثال دے

میں فنا چھوڑا قسم کا آدمی ہوں۔ اور محترمہ میری اس کمزوری سے بخوبی واقف
ہیں۔ میری پسندیدہ ڈشیں اور مربے وغیرہ لاتی ہیں۔ میں مسکرا کر قبول کر لیتا ہوں
بالبتہ ان کے مختصر لباس اور ان کے بچوں کی فلمی چال پر دہی زبان میں تنقید بھی
کر دیا کرتا ہوں۔ وہ مسکرا کر ہاں میں ہاں ملا دیتی ہوں۔ ان کے تائیدی جملے صرف
ان کی لب اسٹک سے چپکے آتے ہیں۔ ان کے تائیدی جملے صرف
میں بھی تنقید کا ناگوار مانا کر دیرِ فرضِ بادا کر کے خاموش ہو جاتا ہوں۔

دیکھنے کا موقع جیسرا آتا ہے۔ میں نے کہا۔ "مولانا، مفت میں کیوں نہیں پہنچ
ہزار کسٹلوار ہے ہی آپ۔" مولانا بگڑ گئے۔ ادھر بیوی بچوں نے تائید شروع
کی۔ آخر کو سازش کا میاب ہوئی، اور ٹی وی گھر آیا۔

بچی کی شادی میں نذر کی جانے والی جوڑے کی رقم ٹی وی پر خرچ ہو گئی،
آزادی کے تین دنوں لے بھی جوڑے کی رقم اور چھبیز کی فہرست کا کیا بگاڑ لیا۔
بالکل اسی طرح ایک صاحب ایم، اے ہیں۔ لیکن ان کی لنگائی، بھائی اور
سازش کی فہم جابری ہے۔ تعلیم نے ایسا کیا بگاڑ لیا۔ پھر حال جوڑے کی
رقم اور چھبیز۔ فرض کی طرح ادا کیے جاتے ہیں۔ البتہ مہر کی رقم لے مذہب کی پناہ
حاصل کر لی ہے اور مختصر سے مختصر ہوئی چلی جا رہی ہے۔ ہر باندھتے وقت اور
طلاق دیتے وقت مذہب کا ہمارا سر چڑھ کر بولتا ہے۔ بچی کی شادی کو بہم کر کے
دنیا سے آگاہی کا آفتاب ٹی وی کی شکل میں ہمارے گھر طلوع ہو گیا ہے۔ شہناؤں
کی تصویریں سے اور بیکچروں کے نور سے ہمارا گھر منور ہو گیا ہے۔ ٹی وی گھر آیا تو
بیوی نے اپنے عزیز واقارب خواتین اور بچیوں نے اپنی دوست لڑکیوں کو خط
لکھ کر فون پر فون کر کے اطلاع دی۔ اب کیا تھا، فلم جس روز دکھائی جاتی اس
نہ ہمارے ہی سے آمد آمد کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ چائے بکٹ کا انتظام اور
پانی کی بوتلی کے بعد عشاء کا اہتمام ہوتا۔ ایکسٹری کی بل اور غلے کو الٹا بکٹ
اسی لڑائی فائدہ اس قلم ہمارا کہ میری بیوی کو میری ایک دوست سے سخت
نہایت اور ہمارے گھر کو آتا بھی ناگوار تھا۔ بیوی بچوں کی دس

ہجریز خواتین کے معاوضے میں میری ایک دوست خاتون کو دو گھوڑیاں بہت اچھی
 بات دی۔ مگر ان کا اور بچہ دیکھنے کا موقع مل گیا۔ میں نے یہ بھی غنیمت جانا
 وہ خالی ہاتھ تھوڑی کتنی تھی۔ میرے پسندیدہ سمو سے اور میری مرغوب گھوڑیاں بنا
 کر لاتی تھی اور چھپا کر اندھیرے میں مجھے دے دیتی تھی۔ میں اس سے آگے کچھ نہیں
 بڑھا کیونکہ مولانا کا پسند و نصح کا سمندر سامنے تھا۔ میں اس پر راضی اور میں وہ
 پار نہ کر سکتا تھا۔ مولانا بھی نظر بچا کر ایک آدھ گھوڑی ساتھ میں ڈال لیتے اور بظاہر
 پیچڑ کی تعریف میں سبحان اللہ "کافروہ بن کر تے"

میسرے گھر سے سو گز کے فاصلے پر ایک خود ساختہ لیڈر کا مکان تھا۔ ان
 کے مکان کی چھت پر Antena نصب ہو گیا تھا۔ میں نے لیڈر صاحب سے
 دریافت کیا: "آپ نے بھی ٹی وی خرید لیا ہے۔ مبارک" کہنے لگے: نہیں جی ہاں
 میں نے اپنے پڑوسی کی لڑکی کا بیہ ایک اہم لیڈر کے لڑکے سے ملے کروایا تو انھوں
 نے ازراہ ہمسایہ توازی یہ Antena نصب کر دیا ہے۔ جس دن چاہوں گا
 دوست احباب کو پیچڑ دیکھنے کے لئے مدعو کروں گا۔ اور آپ کے گھر سے ٹی وی
 منگوا لوں گا۔ جہاں آپ سے کیا تکلف ہے مجھے؟ میں نے صبر کیا اور کہا: ضرور
 ضرور۔ ٹی وی نہ صرف ایک گھر میں پیچڑ کھاتا ہے بلکہ جہاں جاتا ہے
 بھی ہے۔ ٹی وی تو جتنا خریدتی ہے۔ لیڈر صرف Antena نصب کر دیتا

ہے۔

پہلے میں ایک مرتبہ مولانا اپنی بیوی کے ساتھ تشریف لاتے ہیں۔ وہ

کسی شخصیت اور ڈاکٹر کی وجہ سے ساری خواتین ان سے پردہ نہیں کرتیں، مولانا کی
 بیوی بے چاری تیس سال پہلے فوت ہو گئی تھی اور بچہ دیکھتی جاتی ہے۔ درمیان میں کہیں
 کہیں مولانا کا درمیان شروع ہو جاتا ہے۔ دیگر خواتین ناک بھوں چڑھاتی ہیں۔
 جڑ بڑھوتی ہیں یہ سب کچھ ہوتا ہے۔ مجھے کچھ اچھا معلوم ہوتا ہے کچھ نامناسب
 معلوم ہوتا ہے۔ لیکن خاموش ہو جاتا ہوں، اور میری یہ خاموشی ناگوار بھی ہے
 اور ناگزیر ہے۔

ممتاز شخصیتوں

۲

تأثرات

اُس نے چاہا تھا کہانی لکھ کے ہو جا امر
خود کہانی بن گیا، تحریر تک سُوکھی نہیں

غیاث صدیقی

محترمہ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ صاحبہ

ڈاکٹر غیاث صدیقی صاحب کی "باغ و بہار" شخصیت سے میں عرصے سے واقف ہوں۔ ان کی پیگم میری عزیز ہنر شاگردہ چکی ہیں میرے خیال میں حضرت حیدر آباد بلکہ دکن اور شمالی ہند میں بھی غیاث صدیقی صاحب نے اپنی شاعری اور ادب نوازی کا سکہ جمایا ہے۔ اور تقریباً تمام سرسبز آوردہ ادبی شخصیتوں سے ان کی رسم و راہ ہے۔ یہ صرف اچھے شاعر اور ترنکار ہیں بلکہ اچھے نقاد بھی ہیں۔ بالخصوص شاعری کے قدیم دبستان کے رموز و نکات کے ساتھ جدید دبستان کی بوقلمونیوں کا بھی انھیں خوب اندازہ ہے۔ ان کی شاعری غم حیات اور غم کائنات کا ترجمہ ہے۔ اور ان کی شاعری کا کینوس وسیع ہے۔ ان کے ہی مجھے اردو کے ادبا، شعرا اور نقادوں سے خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔

میری دعا ہے کہ ان کی فکر تازہ اور قلم بولیں رہے۔ تاکہ اردو دنیا ایک تازہ کار ذہن کی تخلیقات سے لطف اندوز ہوتی رہے، — اور

گو نگاہِ دہرہ کے بعد بھی انشائیوں کے کئی مجموعے ہمارے ہاتھوں میں
ہوں۔

غیاث صدیقی صاحب کے تعلق سے اور کیا لکھوں۔ صرف ان کی
شخصیت کی ترجمانی کے لئے داغ کا یہ شعر کافی ہے۔
خوش بہت ہوں گے جب ملیں گے آپ
داغ ایک آدمی ہے گرما گرم !

رفیعہ سلطانہ

ڈین فیکلٹی آف آرٹس جامعہ عثمانیہ

۱۹۴۳ء

جناب محمد علی عباسی صاحب

ڈاکٹر غیاث صدیقی صاحب سے میں عرصے سے واقف ہوں۔
 اُن کے اچھے کاموں سے بھی اور شاعری اور مضمون نگاری سے بھی جب میں
 نظامس ٹرسٹ کا معتمد تھا، اُن سے اکثر ٹریسٹ کے مسائل پر گفتگو ہوتی
 تھی۔ اہل خاندان کے تسخ سے اُن کے دردِ دل کا اندازہ ہوتا تھا۔ چنانچہ
 اُن کے مشورے سے کئی اچھے کام ہمارے اذکار (افراد خاندان نظام حیدر آباد)
 کے لئے انجام پائے۔ معاملہ فہم ہیں اور گفتگو میں سلیقہ ہے، جو اکثر شاعروں اور
 ادیبوں میں کم پایا جاتا ہے۔

اُن کی شاعری کے متعدد مجموعے زیورِ فلیح سے آراستہ ہو کر اہل علم
 نقد سے خراجِ تحسین حاصل کر چکے ہیں، جن میں بعض نوجوٹی کے اہل قلم شامل ہیں
 شاعری کا بہت ہی نثرِ اذوق رکھتے ہیں۔ اور دوسروں کے اچھے بُرے شعر
 میں امتیاز کی صلاحیت بدرجہ اتم رکھتے ہیں۔
 نثر نگاری کے میدان میں بھی کبھی قدم رکھتے ہیں اور نہایت دلچسپ۔

اور شگفتہ انداز میں کردار و حالات کی عکاسی کرتے ہیں۔

میں نے "نقہ مجروحہ مضامین" گونگا ورد "تفصیل سے دیکھا ہے۔ یہ انشائیوں اور مزاحیہ مضامین پر مشتمل ہے۔ انھیں پڑھ کر اکثر ہر آنے ممتاز مزاح نگاروں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ بالخصوص "سالی" اور شاعروں کا۔ "قبرستان" میں جسے انداز سے انھوں نے نقشہ کشی کی ہے۔ وہ بے حد دلچسپ اور قابلِ تحسین ہے۔

محمد علی عباسی

ڈاکٹر یوسف سمرست صاحب

غیاث صدیقی صاحب سے مدتوں سے واقف ہوں۔ اُن کے نام اور کام سے سبھی واقف ہیں۔ لیکن جو لوگ اُن کو قریب سے دیکھ سکے ہیں وہ جانتے ہیں کہ اس نام اور کام کے پیچھے ایک وضع دار اور شریف انسان بڑی خاموشی اور لگن کے ساتھ اردو ادب کی خدمت کرنے میں مصروف ہے۔ مجھے بھی غیاث صاحب کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور اُن کی مہمان نوازی اور وضع داری سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔

غیاث صاحب ایک اچھے شاعر ہیں اور اس کے ساتھ ایک اچھے مترجم بھی ہیں۔ شاعری کا ترجمہ سب سے مشکل کام ہے لیکن وہ اُس سے بھی بڑی خوبی کے ساتھ عہدہ سزا ہوتے ہیں۔ وہ جیسے اچھے شاعر ہیں ویسے ہی نثر نگار بھی ہیں۔ اُن کی مزاح نگاری بھی قابلِ قدر ہے۔ اُن کے بعض انشائیے میں نے پڑھے ہیں اور بے حد محظوظ ہوا ہوں۔ وہ زبان و بیان کا پورا پورا خیال

رہتے ہیں اور ان الہی کے ساتھ اس کو بستے ہیں۔ ان کے مزاج کا یہ
انداز دل نشیں ہے۔ اور اس کو دل چسپ اور پُر اثر بنانے میں طنز کی
چٹکیاں بھی شامل رہتی ہیں۔
مزاحیہ انشائیوں کا مجموعہ گونگا درد اردو کے مزاحیہ ادب
میں ایک اضافہ ثابت ہوگا۔

یوسف سرمست

ریڈر شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ

۱۹۸۳ء

ڈاکٹر زینت ساجدہ صاحبہ

ڈاکٹر غیاث صدیقی شاعر کی حیثیت سے جانے پہچانے
حیدر آبادی ہیں۔ مگر اس مجموعے کی اشاعت کے بعد وہ نثر نگاروں میں بھی
شامل ہو چکے ہیں۔

نثر لکھنا شعر کہنے کے مقابل میں کارِ آساں قرار دیا جاتا ہے۔ بلکہ
لوگوں کو حیرت ہوتی ہے کہ نثر لکھنا بھی کیا کوئی فن ہے؟ غیاث صدیقی چونکہ
دونوں میدانوں میں قسمت آزمائی کر چکے ہیں اس لئے وہ شاید کہہ سکیں گے
کہ شعر میں سہارا دینے کے لئے بہت سی بیسیا کھیاں ہوتی ہیں۔ نثر کی
دشت نور دی پیدل کرنی پڑتی ہے۔

ہات واضح، طریقہ اظہار دلچسپ اور لہجہ شریفانہ ہو
آزادی کے باوجود الفاظ کا تصرف بے جا نہ ہو۔ خرمندگی کے
ہو چہلو کو دیکھنے، پرکھنے کی صلاحیت ہو۔ اور ایسی ہی بے
شمار باتیں۔ تب نثر لکھی جاسکتی ہے

اسی مجموعے میں جو چند مضامین شامل ہیں انھیں غیاث کی نثر نگاری
 کا آغاز سمجھنا چاہیے، کمالِ یادِ بنامِ شریف کے کہ یہ مشقِ غنما ہیں
 لیکن باتوں میں سادگی اور موضوعات میں تنوع ہے۔ البتہ بات کرنے میں
 مزید سلیقہ کی ضرورت ہے۔

امکان تو یہی ہے کہ مجموعہ چھپنے کے بعد ان کی
 ہر دلعزیزی فوت نہ رہی، گھائل ضرور ہو
 جائے گی۔

زینت ساجدہ

۱۹۸۳ء

اشک بن کر تری بلکوں سے ٹپک جاؤں گا
 یاد رکھنا مجھے نظروں سے گرائے والے

(غیاث صدیقی)

صفتی بھی کس قدر نادان ہے شاعر ہوا تو کیا
اسے، لوگوں سے، جیتے جی امیدِ قدر والی ہے

(حضرت سیدنا محمدؐ کی یاد میں)